افکار و اشخاص

حکیم محمد سعید



افکار و اشخاص

حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
کراچی

مؤلف	:	حکیم محمد سعید
ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ہمدرد سنٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی ۷۴۶۰۰
طابع	:	فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی
سال اشاعت	:	۱۹۹۲ء
پہلا ایڈیشن	:	دو ہزار
قیمت	:	پچھتّر (۷۵) رُپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مسعود احمد برکاتی

خیال بھی عجیب شے ہے۔ دنیا اس کی محتاج ہے، مگر یہ بھی کم محتاج نہیں۔ جب تک کوئی قوی محرّک نہ ہو، یہ حرکت میں نہیں آتا اور جب حرکت میں آتا ہے تو دنیا کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ تقریر ہو یا تحریر، خیال کی محتاج ہے۔ بہت سی تحریریں کسی وقتی محرّک کے تحت لکھی جاتی ہیں، لیکن خیال و اظہار کی قوّت کے لحاظ سے دائمی افادیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے بعض مضامین کے مجموعے مستقل کتاب سے زیادہ اہم اور خیال افروز ہوتے ہیں۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب کا یہ مجموعۂ مضامین بھی اپنی افادیت کے لحاظ سے مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس کی تقریباً تمام تحریریں کسی موقع کی مناسبت سے اور کسی مجلسی تقاضے کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ یہ تحریریں دراصل تقریریں ہیں جو کسی نہ کسی تقریب، کانفرنس یا اجتماع میں کی گئی ہیں۔ اسی لیے ان میں موضوع کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ سامعین کے روبرو ہونے کے احساس سے جو جوشِ بیان اور حسنِ کلام پیدا ہوتا ہے، وہ بھی موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علمی موضوعات اور سنجیدہ محفل میں جوشِ کلام کا وہ انداز نہیں ہوتا جو مذہبی، سیاسی یا عوامی عنوانات اور جلسوں میں ہوتا ہے، لیکن تخاطب میں بہرحال ایک دوطرفہ پن (TWO WAY) ہوتا ہے جو تقریر کو چھپی ہوئی تحریر سے ممیز کرتا ہے۔ یہ خصوصیت اس کتاب کے مشمولات میں بھی ہے۔

اس مجموعے کی تمام ۳۶ تحریریں ادب و ثقافت کے عنوانات کے تحت آتی ہیں۔ ادب پر اصولی مباحث کے علاوہ غالب، اقبال، بھٹائی، حسرت، خٹک، عبدالحق، سیماب اور مجنوں کے متعلق حکیم صاحب نے مختلف مواقع پر مختلف اجتماعات کے سامنے جو تاثرات و خیالات ظاہر کیے، ان میں حکیم صاحب کا اپنا اندازِ فکر بھی ہے اور توازنِ اظہار بھی۔ رسائل کے کردار، پاکستانی ثقافت، فارسی زبان و ادب، جلال الدین رومی، صحافت اور کتاب و کتاب خانوں کے متعلق جو

تحریریں اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں ان میں بھی یہی خصوصیات ہیں۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب کی فکر کے مرکزی نقطے تین ہیں : علم کی محبّت، احترامِ عالم و ادیب اور تعمیرِ پاکستان۔ یہ تینوں نقطے ان تحریروں میں بھی رَچے اور پھیلے ہوتے ہیں۔ ان تحریروں کو مرتب کرتے وقت ذہن میں یہ بات بھی رہی کہ ان تحریروں کو اس لحاظ سے بھی محفوظ ہونا چاہیے۔ جن مسائل پر ان تحریروں میں گفت گو کی گئی ہے، وہ ہماری ثقافتی زندگی کے بنیادی مسائل ہیں اور جن شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی خدمات اور افکار ہمارا قابلِ قدر تہذیبی سرمایہ ہیں۔ ان کے متعلق ایک ایسی شخصیت کے جو اپنے مختلف الجہات کارناموں کی بنا پر مقامِ توقیر پر فائز ہے، تاثرات یقیناً قابلِ مطالعہ اور لائقِ فکر ہیں۔

ادب و ثقافت

ادب انسانی معاشرے اور قومی روایات کے ساتھ ساتھ تہذیبی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ ثقافت ملّی تشخص اور اقدار عالیہ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ادب کا مطالعہ ذہنی ترفع اور روح کی بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔

ادب اور تعمیرِ ملّت

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ادب سے تعمیر و تخریب اور استحکام و انحطاط کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ ادب کسی قوم کو طاؤس و رباب یا شمشیر و سناں کی طرف لے جاسکتا ہے۔ ادب اُسے غلامی و محکومی پر بھی قانع کر سکتا ہے اور دوسری قوموں کا راہ نما بھی بنا سکتا ہے۔ قومی اخلاق اور کردار کی تشکیل و تعمیر میں ادب کا بہت اہم حصّہ ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ادب تعمیر و تشکیل کا اہم ترین عنصر ہے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ انسان کے اخلاق و کردار کے لیے جو چیز سب سے زیادہ موثر اور کارگر ثابت ہوتی ہے وہ ذہن اور فکر کی قوّت ہے اور ذہن و فکر کی قوّت ادب سے جنم لیتی ہے۔

دنیا کی علمی اور فکری رہ نمائی میں یونان کا جو حصّہ ہے اس سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن افلاطون اور ارسطو جیسے اکابر پیدا کرنے والی قوم جب فکری انحطاط کا شکار ہوئی تو نہ صرف اپنی عظمت سے محروم ہوگئی، بلکہ دنیا کے لیے نمونۂ عبرت بھی بن گئی۔ ایک زمانہ تھا کہ انگلستان روم کا محکوم تھا اور غلامی کی ذلتیں برداشت کر رہا تھا۔ روم کے طلسم کو توڑنے میں سب سے بڑا حصّہ انگلستان کے ادب کا ہے۔ نکبت و فلاکت کے گڑھے میں گری ہوئی اس قوم کے مفکرین آگے بڑھے اور انھوں نے ایسا ادب تخلیق کیا جس نے اس قوم کی کایا پلٹ دی اور دنیا کی قیادت اس کے ہاتھ میں دے دی۔ فرانس کی حالت انگلستان سے بھی بدتر تھی، مگر چند کتابوں نے یورپ کے اس اہم ملک کو جمہوری اقدار کا محافظ اور علم بردار بنا دیا۔ جرمنی کی عظمت متعدد شکستوں کے باوجود صرف اس کے ادب میں مضمر ہے۔ روس کے انقلاب کا بانی اس کا ادب اور چین کی کایا پلٹ کا باعث چینی ادب ہے۔ آخری مثال خود ہماری اپنی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے اور غلامی کی ذلّت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ ان میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے اور تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان کو مقبول بنانے میں ہمارے ادب نے اہم

ترین کردار ادا کیا۔

غرض قوموں اور جماعتوں کے عروج وزوال اور ادبار واقبال یا بہ لفاظ دیگر تخریب و تعمیر میں سب سے موثر اور فیصلہ کن حصّہ ادب ہی کا ہوتا ہے۔ ادب ایک ایسی فعال قوّت ہے جو ذرے کو آفتاب بنا دینے میں کمال رکھتی ہے۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے اور قدم قدم پر ادب کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کی شہادت دیتی ہے۔

ایک نظریاتی مملکت میں عالم و ادیب کا کردار

باور کیا جاتا ہے کہ یورپ میں مذہب اور سائنس میں تصادم کا اصل باعث اہلِ کلیسا میں وسعت نظر کا فقدان تھا۔ درحقیقت وہ یونانی ورثے کو بھی سائنسی حقائق سمجھ بیٹھے تھے اور انھوں نے اسے تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی پر انھیں جابرانہ تسلط حاصل تھا۔ وہ مذہب کے نام پر اقتدار کے مالک بن گئے تھے اور کسی قیمت پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کو تیار نہ تھے۔ چناں چہ جب نظری اور تجرباتی طور پر سائنس نے ان کے بہت سے مفروضات کو، جنھیں وہ حقائق کا درجہ دے چکے تھے، غلط ثابت کر دیا تو ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور اپنے نظریات کی اصلاح کرنے کے بجائے وہ ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئے۔ وہ بدستور اپنی غلطی پر مصر رہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ کلیسا اور سائنس دانوں میں ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اہلِ کلیسا خود کو اختیاراتِ الٰہی کا حامل سمجھتے تھے، اسی لیے جب بھی سائنس دانوں نے ان کی کسی رائے سے اختلاف کیا انھیں شدید ترین جسمانی اذیتوں میں مبتلا کیا گیا اور معمولی معمولی باتوں پر انھیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ چناں چہ جب کلیسا اور سائنس کی یہ کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تو لوگوں میں کلیسا کے مذہبی جبر و تشدد کے خلاف شدید ردِعمل پیدا ہوا اور اہلِ علم میں اس سے نجات پانے کی خواہش انتہائی شدت پکڑ گئی۔

اس وقت سے اہلِ مغرب میں اب یہ خیال عام ہے کہ سائنس نے مذہب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پسپا کر دیا ہے کیوں کہ اب اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ تقریباً سبھی ماہرینِ نفسیات و عمرانیات اس خیال کے حامی رہے ہیں۔ یورپ کا مشہور ماہرِ نفسیات فرائڈ مذہب کا مذاق اڑاتا تھا۔ چناں چہ اس نے لکھا ہے کہ "انسانی زندگی تین واضح نفسیاتی ادوار میں سے گزری ہے، دورِ وحشت، دورِ مذہب اور دورِ سائنس۔ اب سائنس کا دور ہے لہٰذا مذہب کی باتوں میں اب کوئی معنویت نہیں رہی۔ وہ فرسودہ ہو چکا اور اپنی تمام قدر و قیمت کھو چکا۔"

غرض اہلِ کلیسا کے غیر دانش مندانہ کردار کی وجہ سے یورپ کے مفکرین بجا طور پر یہ سمجھنے لگے کہ

مذہب رجعت پسندی، بربریت، تاریک خیالی اور بے معنی افکار و اعمال کا مجموعہ ہے۔

مذہب کے بعض مسلمان مخالفین جو اپنے مغربی استادوں کے وفادار شاگرد ہیں، وہ بھی اپنے استادوں کی تقلید میں بغیر سمجھے بوجھے مذہب اسلام کو کلیسائی نظام کا مترادف خیال کرنے لگے۔ یورپ کی اندھی تقلید میں انھوں نے یہ سمجھا کہ یورپ والوں نے مذہب سے پیچھا چھڑالیا۔ اس لیے ہمیں بھی مذہب کی پیروی ترک کر دینی چاہیے۔ کاش یہ لوگ بصیرت سے کام لیتے اور اس حقیقت کو دیکھ پاتے کہ یورپ جس مذہب کے خلاف بغاوت پر مجبور ہوا تھا وہ اسلام نہیں تھا بلکہ اس سے بالکل مختلف نوعیت کا مذہب تھا۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جن حالات و واقعات نے اہل یورپ کو اپنے مذہب سے بے زار و برگشتہ کیا وہ صرف یورپ تک ہی محدود تھے۔ ان کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔ کم از کم اسلامی تاریخ تو اس طرح کے حالات و واقعات سے قطعاً ناآشنا ہے۔

مذہب سے لگاؤ

اب یہ حقیقت آہستہ آہستہ تمام مسلمانوں پر از سر نو منکشف ہو رہی ہے۔ شاید اقبال کی اس دعا کو کہ، "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل" درجۂ قبولیت عطا ہو گیا ہے۔ یورپ ہو یا امریکا، مشرق وسطیٰ ہو یا افریقہ ہر جگہ مسلمان نوجوانوں میں احیائے دین کا جذبہ بے پناہ قوت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔ اب مادی ترقی کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے انھیں اس بات پر اکسا رہی ہے کہ وہ مادی منفعت کے ساتھ روحانی سکون بھی حاصل کریں۔ جیسا کہ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ اطمینانِ قلب صرف ذکر اللہ ہی میں میسّر آ سکتا ہے۔ قلب کا اطمینان نہ ستاروں تک پرواز میں ہے نہ خلاؤں کی تسخیر میں۔ یہ اگر ہے تو صرف اللہ کی یاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کے دلوں میں یہ ایقان مستحکم کر دے۔

پاکستان اور اسلام

اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان جیسا شان دار ملک ہماری انھی تمناؤں اور دعاؤں کے نتیجے میں عطا کیا تھا کہ ہم اس میں اللہ کا کلمہ بلند کریں گے اور اس کے واحد پسندیدہ نظامِ حیات ــ اسلام ــ کو عملی زندگی میں نافذ کریں گے۔ اسلام کیا ہے؟ اسلام غلامی کی ہر اس نوع سے آزادی کا نام ہے جو ارتقائے انسانیت میں رکاوٹ بنتی ہے اور نیکی اور بھلائی کی راہ سے روکتی ہے۔ اسلام کی تعلیم انسان کو خوف، ظلم، بے انصافی اور لوٹ کھسوٹ سے نجات دلاتی ہے۔ وہ صرف اللہ کی تابع داری کا سبق دیتی اور بتاتی ہے کہ

کائنات کی تمام چیزیں اللہ نے انسان کی خدمت اور فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔ اس لیے وہ اللہ کی مقرّر کردہ حدود میں رہتے ہوئے انھیں مسخر کرے اور عام انسانوں کے فائدے کے لیے مختص کردے۔ خود بھی بہرہ مند ہو اور تمام ابنائے جنس بھی ان سے نفع وراحت حاصل کریں۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اسلام ہی کے نام پر یہ مملکت وجود میں آئی۔ اسلام ہی کے دامن میں اسے پھلنا پھولنا نصیب ہوسکتا ہے۔ اسلام سے انحراف نہ صرف زندگی کے حقائق سے انحراف ہے بلکہ اپنے اجتماعی تشخص سے صریحی روگردانی بھی ہے۔ ہمیں اسلام ہی کے متعین کردہ اصولوں کے تحت اجتماعی شعور پیدا کرنا ہے اور ایسی قومیت کو پروان چڑھانا ہے جو یورپی طرز فکر کی قومیت سے مختلف ہو۔ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک عظیم وحدت، ایک عظیم اجتماعیت اور ایک عظیم ملت سمجھتے ہیں۔

ہم پاکستانی قوم کو اس عظیم تر اسلامی قومیت کی ایک اکائی شمار کرتے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں جس کا ایک عضو پاکستان ہے۔ پورے جسم کی سالمیت کے لیے ہر عضو کی صحت وسالمیت ناگزیر ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم خود بھی مثالی مسلمان بنیں اور اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے جو کرۂ ارض کے مختلف خطّوں میں پھیلے ہوئے ہیں ایک قابل تقلید نمونہ پیش کریں۔

کسی بھی نظریاتی مملکت کی بقا اور اس کے نشو نما کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کے علم بردار اور نام لیوا اس نظریے پر غیر متزلزل ایمان ویقین رکھتے ہوں۔ ایمان عمل کا منبع ہے۔ یقین کے بغیر عمل وجود میں نہیں آتا۔ اسی لیے قائداعظمؒ نے اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کی تلقین کی تھی۔ ان تین لفظوں میں انسانی جدوجہد کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ زیادہ گہرائی کے ساتھ ان پر غور کیا جائے تو آسانی کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ ان میں یقین یعنی ایمان ہی کو اولیت یا بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جماعت متحد ہو اور اس میں تنظیم بھی موجود ہو، لیکن جب تک کوئی منزل متعین نہ ہو اور اس کے حاصل کرنے کا دل میں یقین نہ ہو اس وقت تک نہ قدم اٹھے گا اور نہ حرکت میں برکت حاصل ہوگی۔ اس حقیقت کے پیش نظر بلاتامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی راہ وہی ہے جو انسانی تاریخ میں برپا ہونے والی ہر تحریک کو اختیار کرنی پڑی ہے اور یہ راہ ایمان والیقان اور نظریے پر کامل اعتماد کی راہ ہے۔

صدر اوّل میں قوت کا سرچشمہ

صدر اوّل کے مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ یہی ایمان تھا۔ آج کے مسلمان کی نجات کا راز بھی اسی

میں پوشیدہ ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے آج ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ صدر اوّل کے مسلمانوں کی حالت سے کچھ مختلف نہیں۔ وہ مٹھی بھر لوگ تھے مگر اس وقت کی دو سب سے طاقت ور حکومتوں، روم اور ایران کے خلاف برسر پیکار تھے جو افرادی قوت، مادی ثروت، دولت، فنون حرب و ضرب اور سیاسی طاقت ہر لحاظ سے مسلمانوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود پچاس برس سے کم عرصے میں مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ دونوں کا غرور خاک میں ملا دیا اور بحیرۂ احمر سے لے کر بحیرۂ روم تک سارے علاقے پر فتح حاصل کرلی۔ ان کی یہ کامیابی تاریخ میں ایک عظیم معجزہ کہلاتی گئی۔ تاریخ کی کسی مادی تشریح اور تعبیر کے ذریعے سے اس عظیم تاریخی معجزے کی حقیقت تک پہنچا ہی نہیں جاسکتا۔ اسے صرف ایمان اور یقین کے حوالے ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نظریاتی مملکت کی کامیابی

اس حقیقت کے پیش نظر آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نظریاتی مملکت کی کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام لوگوں میں نظریے سے محبت ہو اور اس کی حفاظت کے لیے وہ اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ رہیں۔ یہ جذبہ، یہ محبت، یہ لگن اور یہ والہانہ شیفتگی اس وقت تک دلوں میں پیدا نہیں ہوسکتی جب تک نظریے کی صداقت پر غیر متزلزل یقین نہ ہو۔ اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح یہ صرف اعتقادات کا مجموعہ نہیں بلکہ معاملات زندگی کے لیے بھی اس میں اصول و قوانین منضبط ہیں۔ اس لیے کوئی مسلمان کسی بھی مسئلے میں پیشانی پر بل نہیں ڈال سکتا۔ ہاں اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسئلے کی چھان بین کرے۔ ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت مسلمان پر فرض ہے اور اس میں چوں و چرا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اعلان ہوا کہ شراب ممنوع ہوگئی تو جہاں جس کے پاس جو کچھ تھا اس نے بہا دیا۔ کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ انگور کی شراب حرام کی گئی یا کھجور کی؟ اس لیے کہ نظریۂ حیات پر اس کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ اسے یقین تھا کہ رسول اللہؐ کی ہدایات پر عمل کرنا ہی اس کے لیے ذریعۂ فلاح و نجات ہے۔

نظریۂ حیات پر یقین کامل پیدا کرنا قائدین قوم کی ذمے داری ہے۔ لیکن آج کی دنیا اب اس قدر ترقی کرچکی کہ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقات اشتراک عمل کریں اور اپنے اپنے طور پر نظریے کی صداقت اس طرح لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کریں کہ وہ ایک نظریاتی مملکت میں اپنے فرائض ادا کریں اور مملکت کے نظریات سے اپنی زندگی کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش کریں۔

عالموں اور ادیبوں کی ذمے داری

اس سلسلے میں اہل علم اور ارباب قلم کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قلم کی دھار تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ بات مبنی برحقیقت ہے۔ تلوار کے ذریعے سے کسی قوم کو مغلوب کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے دل ودماغ پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ قلم کے ذریعے سے فرد، جماعت یا قوم میں ایسی تبدیلی لائی جا سکتی ہے کہ ان کی ماہیت قلب ہو جائے۔ قلم کی اہمیت کا خیال آتے ہی ذہن میں بے ساختہ پہلی وحی کے الفاظ ابھرنے لگتے ہیں۔ رسول کریمؐ پر آج سے چودہ سو سال قبل جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا اور اس کائنات میں انسان کے معرض وجود میں آنے کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ :

اقرا وربّك الاكرم ○ الذی علم بالقلم ○ علم الانسان ما لم یعلم ○

(العلق : ۳، ۴، ۵)

(پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔)

گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کائنات میں سب سے اشرف اور سب سے احسن مخلوق انسان کو پیدا کیا۔ اسے تمام کائنات پر اس طرح فوقیت عطا فرمائی کہ قلم اس کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ اب علم وحکمت حاصل کرے اور اس کے ذریعے سے کائنات کی تسخیر عمل میں لائے۔ علم بالقلم کہہ کر اللہ تعالیٰ نے قلم کی اہمیت جتا دی اور اہل قلم اور صاحبان علم وادب کو کائنات کے سنوارنے، تسخیر کرنے اور اُسے زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے مفید بنانے کی ذمے داری سونپ دی۔

معاشرے میں جو ادیب وشاعر ہوتے ہیں وہ بھی اس کی تعمیر یا تخریب کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ ذہن ودماغ کو متاثر کرتے اور انھیں جس راہ پر چاہیں ڈال دیتے ہیں۔ ادیبوں کو معاشرے کے معمار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح معمار آہستہ آہستہ اینٹوں کو جوڑ کر عمارت تیار کرتا ہے اسی طرح ادیب اپنے اشعار اور اپنے ادب سے لوگوں کے اذہان کو غیر محسوس طریقے پر متاثر کرتا ہے اور آخرکار انھیں ایک خاص نہج پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ ادیبوں کے اس اہم کردار کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نظریاتی مملکت میں ادیبوں کے تعمیری کردار کے ذریعے سے منزل پر پہنچنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

قرآن حکیم

ہم مسلمانوں کے نزدیک قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور دنیا کا بہترین ادب پارہ ہے۔ فصاحت و بلاغت اور تمام دوسری ادبی خوبیوں کا مرقع ہے۔ ایک غیر معمولی، بے مثل اور نادر مجموعۂ ادب ہے۔ چناں چہ جب قرآن کے اولین مخاطبین نے اسے سنا تو وہ دم بہ خود رہ گئے اور اسے جادو کہنے لگے۔ حال آنکہ یہ کتاب نہ شاعری ہے نہ ساحری بلکہ ادب کا ایسا شاہ کار ہے کہ سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ قریش قرآن حکیم کی معجز بیانی کے اس حد تک قائل تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ قرآن سنیں کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ جو شخص بھی توجہ سے قرآن کی آیتوں کو سنے گا وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

قبیلۂ بنو عامر کے بحیرہ بن فراس نامی ایک شخص نے قرآن حکیم کی آیتیں سن کر کہا "یہ مجھ کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کرلوں"۔ ایک بار قریش کی جانب سے عتبہ بن ربیعہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا کہ مکے کی ریاست، بڑے گھرانے میں شادی، دولت کا ذخیرہ یہاں تک کہ قوم کی سرداری بھی، ہم یہ سب کچھ مہیا کرسکتے ہیں، لیکن تبلیغ سے باز آجاؤ۔ آپؐ نے قرآن کی چند آیتیں پڑھیں تو عتبہ مبہوت ہوکر واپس ہوگیا اور قریش سے جاکر کہا "جو کلام محمدؐ پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے"

غرض قرآن حکیم دنیا کا بہترین ادب پارہ ہے اور اس کا معجزہ یہ ہے کہ اس نے اب سے چودہ سو سال قبل یہ دعوا کیا تھا کہ تمام لوگ مل کر بھی اس جیسی ایک سورت نہیں بنا سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بے شمار معترضین کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص اس چیلنج کو قبول نہ کرسکا۔ رسول اللہؐ نے تیئیس سال کی مدت میں دنیا میں وہ انقلاب برپا کیا جس کی مثال عالمی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بے شک آں حضرتؐ کی ذات قدسی صفات کا یہ وہ ابدی کارنامہ ہے جس کی بنیاد قرآن حکیم پر قائم تھی۔

آں حضرتؐ کے خطبات

مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے اس لیے ادب عالیہ کے بہترین نمونے کی حیثیت سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات صحیح ہے۔ اس کے ساتھ ہی آں حضرتؐ کے خطبات اور تقریریں بھی جو دنیا میں آج تک موجود ہیں ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر آں حضرتؐ کی وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے جو آپؐ نے حنین سے واپسی پر جعرانہ کے مقام پر اس وقت فرمائی جب معلوم ہوا کہ مال غنیمت کی تقسیم پر انصار کے بعض نوجوانوں کے دلوں میں انقباض پیدا ہو رہا ہے۔

آپؐ نے فرمایا، "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گم راہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت کی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے، اللہ نے میرے ذریعے سے تم کو دولت مند کیا؟ آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرے پر انصار کہتے جاتے تھے کہ اللہ اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد آپ ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح آپؐ ان کے دلوں کو مضطرب کر دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، "تمہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی تو مفلس آیا تھا، ہم نے ہر طرح مدد کی۔" یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔" سبحان اللہ وبحمدہ! کیا اندازِ خطاب ہے۔ کیسا ادبی شہ پارہ ہے۔ آپؐ نے یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر انھیں بالکل بے قابو کر دیا کہ، "اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھر آؤ؟" انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں۔" اکثر کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہوگئیں۔ کیا آج ہم اس نظریاتی مملکت میں نظریۂ اسلام کی حقیقت لوگوں کے دلوں میں اس طرح نہیں اتار سکتے کہ لوگوں میں اسلامی احکام کی پیروی کا پھر وہی جذبہ پیدا ہو جائے جو صدیوں ان میں موجزن رہا تھا؟ بے شک آج بھی ابراہیمؑ کا ایمان پیدا ہو سکتا ہے اور آگ گلزار بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہی ہے کہ ہمارے ادیب اور عالم اپنی ذمّے داری کو محسوس کریں اور لوگوں کے دلوں میں نظریے کی لگن جاگزیں کر دیں۔

دورِ وسطیٰ کا اردو ادب

سنہ ۱۸۵۷ء کی وقتی طور پر ناکام جدوجہد کے بعد برِّصغیر کے مسلمانوں پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھا گئی تھی کہ بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ یہ قوم پھر زندہ ہو سکے گی اور کاروانِ حیاتِ اجتماعی پھر جادہ پیما ہو سکے گا۔ اللہ بھلا کرے سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقائے کار کا کہ انھوں نے ادبی محاذ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیا اور ایسا شاندار لٹریچر مہیا کر دیا کہ قوم ازسرِنو انگڑائی لینے لگی۔ کوئی قوم ایسی نہیں کہ جب اس کا شاعر آواز دے کہ :

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
دوا جس کی خالق نے کی ہو نہ پیدا

تو وہ ایک بار آنکھ کھول کر نہ دیکھے اور اپنی بیماری کا علاج تلاش نہ کرے۔

سرسید، شبلی، حالی اور ان کے تمام دوسرے معاصرین نے مسلمانوں میں از سرِ نو جان پیدا کر دی۔ برِصغیر کا مسلمان ان ادیبوں کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اسے اسلام کی عظمت یاد دلائی اور یہ بتایا کہ اسلامی نظریہ ہی اس کی دنیاوی سربلندی اور اخروی نجات کا وسیلہ ہے۔ دیکھیے کہ ادیب کس کس طرح قوم کے دل میں اپنی بات اتارتا ہے۔ ایک جگہ حالی نے یہ ذکر کیا کہ کسی نے ایک دانا سے پوچھا کہ سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ دانا نے جواب دیا "عقل! یہ نہ ہو تو علم و فن اور یہ بھی نہ ہو تو دولت"۔ سائل نے کہا کہ اگر ان میں سے کچھ نہ ہو تو؟ اس کے جواب میں دانا کی زبان سے حالی کہتے ہیں:

کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر

اور

وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کی مسلمہ اقدار اور نظریۂ حیات کی حفاظت کا کام ادیبوں ہی کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ وہ چاہیں تو قوم میں نظریۂ حیات کے ساتھ لگن پیدا کر دیں اور چاہیں تو اسے گم راہ کر دیں۔

سرسید احمد اور ان کے ہم عصر ادیبوں نے مسلم معاشرے میں از سرِ نو جان پیدا کر دی۔ انھی دنوں اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے انجمن حمایت اسلام لاہور نے اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابیں شائع کیں۔ یہی کتابیں پورے برِصغیر کے مسلمان بچے پڑھتے تھے۔ اس کا پہلا سبق غالباً اس طرح شروع ہوتا تھا کہ اللہ ایک ہے۔ وہ پاک اور بے عیب ہے۔ اس جیسا کوئی اور نہیں۔ وہ سب سے بڑا بادشاہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کتابوں کے مضامین اس طرح مرتب کیے گئے تھے کہ بچوں کو اردو زبان کے علاوہ اسلام کی بنیادی باتیں بھی معلوم ہو جاتی تھیں اور اسلاف کے قابلِ تقلید کارناموں کی ایک جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر ابتدائی کتابیں آج تک نہ لکھی جا سکیں۔ اس دور میں ہمارے ادیبوں نے جو لٹریچر مہیا کیا اس کا محور اسلام تھا اور مسلمان بچے بچیوں میں اسلاف کی محبت، ان کے شان دار کارناموں سے واقفیت اور غیر محسوس طریقے سے دلوں میں عظمتِ رفتہ کی بحالی کی تمنا پیدا ہو جاتی تھی۔ بچوں کی زبانوں پر جو اشعار ہوتے تھے ان کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

الف سے اللہ کو جانو، ب سے بسم اللہ کو   ت سے ہے تیرا اشارہ بس رسول اللہ کو

مسدس حالی کے اکثر اشعار ورد زبان ہوتے تھے اور بیت بازی کے رواج کی وجہ سے اکثر بچوں کو سیکڑوں اشعار اس طرح یاد ہوتے تھے کہ جب چاہا سنا دیا۔ ان تمام ادبی کاوشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ بچے عموماً اسلام کی محبت سے سرشار ہوتے تھے اور وہ بھی جو اتفاقاً جوانی کی دیوانگی کی وجہ سے بہک جاتے تھے آخر کار اپنے محور پر واپس آجاتے تھے۔

ادیبوں کا دوسرا شاندار دور تحریک خلافت کا اہم عصر سمجھنا چاہیے۔ اس دور میں ایسا انقلابی لٹریچر پیدا ہوا جس نے مسلمانوں میں نہ صرف احیائے دین کی تڑپ پیدا کر دی بلکہ انھیں از سرِ نو انگریزوں کے استبداد کے خلاف محاذ آرا ہونے پر تیار کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا اکرم خاں اور دوسرے بے شمار ادیبوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کا احاطہ کرنا اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں اسلامی رجحان کے خلاف بھی کئی ادیب صف آرا نظر آتے ہیں۔ یہ زیادہ منظم بھی تھے۔ تاہم دورِ اوّل میں اسلامی نظریات سے جو والہانہ محبت پیدا کی جا چکی تھی اس کی بنیاد ہلائی نہ جا سکی۔ عام طور چند افراد کے سوا پوری قوم اسلام پر قربان ہونے کے لیے تیار رہی اور مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے ہم خیال اکابر اس بنیادی نظریے کی کامیابی کے ساتھ آبیاری کرتے رہے۔

جب خلافت تحریک شروع ہوئی اس وقت مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک دین داروں کا طبقہ تھا جو الحاد کے سیلاب سے قوم کو بچانا مشکل سمجھتے ہوئے مدرسوں اور خانقاہوں میں سمٹ گیا تھا۔ دوسرا نئی روشنی والا انگریزی داں یا مغرب زدہ طبقہ تھا۔ دونوں میں بعد المشرقین تھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ آخر کار صورت یہ پیدا ہو گئی کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے قریب ہو گئے اور محسوس کرنے لگے کہ ان میں سوائے غلط فہمی کے اختلاف کی کوئی بنیادی وجہ نہیں۔ یہ اتنا شاندار کارنامہ تھا کہ اس کا جواب نہیں۔ یہ کارنامہ کن لوگوں نے انجام دیا؟ یہ ادیبوں ہی کا بے مثال کارنامہ تھا جس نے مسلمانوں میں وحدتِ فکر پیدا کی اور حریت کا جذبہ بیدار کیا یہاں تک کہ جب سیاسی قائدین نے منزل کا تعین کیا تو پوری قوم ایک منظم اور متحدہ قوت کے ساتھ ہر قسم کی جاں فشانیوں اور قربانیوں کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ اس دور میں مخالف تحریکیں بھی پیدا ہوئیں۔ ایسے ادیب بھی سامنے آئے جنھوں نے قوم کو منزل سے بھٹکانے کی کوشش کی۔ دوسرے نظریاتِ حیات پیش کیے اور "جدیدیت" کے ملمع شدہ لبادے کو اصل بتانے کی کوشش کی گئی، لیکن مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے ان کے ہم خیال رفقائے کار کی صداقت، بے لوثی اور قلم کی طاقت نے تمام غبارِ راہ صاف کر دیے۔ پہاڑوں کی بلندی، صحراؤں کی وسعت اور سمندروں کی موجیں، کوئی چیز بھی

ان کے عزائم میں تزلزل پیدا نہ کرسکی اور وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھتے رہے کہ :

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

خاص طور پر علامہ اقبال کی شاعری نے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور اسلامی عقائد و افکار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ عظمت اسلاف سے آشنا کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں اسلام کی محبت پیدا کرنے میں اقبال کے ادب نے بڑا زبردست کردار ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال کا کلام ایک نظریاتی مملکت میں ادیب کے کردار کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اگرچہ جس نظریاتی مملکت کا خواب علامہ نے دیکھا تھا وہ ان کی زندگی میں وجود میں نہ آسکی، لیکن ان کے افکار اور ان کا کلام آج بھی پاکستان کے ادیبوں کے لیے مشعلِ راہ ہے اور فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ہمارے ادیبوں کی رہ نمائی کرتا ہے۔

ادب کی بے پناہ طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے انھی دنوں ہونے والا ایک واقعہ سن لیجیے۔ اس کے راوی ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ جب کان پور کی مسجد میں مسلمان جمع ہوئے تو باہر انگریزوں نے فوج متعین کر دی۔ ایک جانب نہتے مسلمان تھے اور دوسری جانب انگریز حکمراں کی جابرانہ طاقت تھی۔ مسلمان جوش سے پُر تھے۔ جان دینے پر آمادہ تھے۔ مسلمان حق پر قربان ہوجانے کے لیے بے چین تھے۔ بار بار جوش و غضب سے پُر وہ مسجد سے باہر آکر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ بڑھتے تھے، لیکن پیچھے آجاتے تھے۔ ایسے میں ایک پُرجوش آواز نے للکارتے ہوئے غالب کا شعر پڑھ دیا کہ :

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

بس تذبذب کا بند ٹوٹ گیا اور مسلمان جوشِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور جامِ شہادت پیتے رہے۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس نظریاتی قلعے کو مستحکم کرنے کے لیے ادیبوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان کا اشتراکِ عمل اس نظریاتی مملکت کے لیے ضروری ہے۔ ادیبوں میں اخبار نویس، شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور تمام دوسرے اصنافِ ادب سے دل چسپی رکھنے والے اربابِ فکر و قلم شامل ہیں۔

ان ادیبوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اسلامی نظریۂ حیات

پر اس طرح یقین نہیں رکھتے جس طرح رکھنا چاہیے۔ یعنی وہ سماجی اور معاشی طور پر دوسرے نظریہ ہائے حیات کے ماننے والے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہمارا دین تو اسلام ہے، لیکن معیشت سوشلزم ہے۔ یہ لوگ اسلامی نظریۂ حیات پر کامل یقین نہیں رکھتے اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نظریۂ اسلام کی حمایت کریں گے ایک امید موہوم ہے۔

دوسرا طبقہ مذبذبین کا ہے۔ ان کا معاملہ نیم دروں نیم بروں کا ہے۔ انھیں جس نظریے کی حمایت دنیا وی طور پر سود مند معلوم ہوتی ہے اس کے گُن گاتے ہیں۔

تیسرا طبقہ ان مسلمان ادیبوں کا ہے جو :

ادخلوا فی السلم کافۃ (البقرۃ : ۲۰۸)

(تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ)

پر یقین محکم رکھتے اور اسلام ہی کی تعلیم میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ یہ طبقہ چوں کہ مخلص، ایمان دار اور نظریۂ حیات سے بے لوث محبت کرنے والوں کا ہے اس لیے ہر حال میں وہ :

وتامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران : ۱۱۰)

(تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو)

کا فرض بجا لاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسرے طبقے کو تیسرے کے ساتھ منسلک کیا جائے اور ان کی سرپرستی کی جائے تاکہ "بے وفاؤں" کو بھی یہ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے اور پھر اپنے فرائض ملّی میں مصروف ہو جائے۔

اسی کے ساتھ ہمیں چاہیے کہ ہر بڑے شہر میں چند ادارے ایسے قائم کریں کہ جو نوجوان اور نوآموز لکھنے والوں کی سرپرستی کریں اور انھیں مضامین، افسانے، ناول، ڈرامے اور شاعری وغیرہ کی راہ پر لگانے کی کوشش کریں اور نظریاتی طور پر بھی مستحکم کریں۔ اس طرح ہر صنف ادب میں ایسے لکھنے والے پیدا ہو جائیں گے جو پاکستانی نظریے کی حمایت میں لکھیں گے۔ ہر نظریاتی مملکت کے استحکام کا تقاضا ہے کہ ادیبوں کی ایک بڑی جماعت ایسی ہو جو خود اس نظریے پر یقین رکھتی ہو اور جو کچھ لکھتی ہو نظریۂ حیات سے پوری وابستگی کے ساتھ لکھتی ہو۔

غرض اسلام پر لکھنے والے ادیبوں کی ہمت افزائی کے علاوہ ایسی تدبیریں اختیار کرنی چاہییں جن سے لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ یہ کام حکومت کے علاوہ غیر سرکاری اداروں کے قیام کے ذریعے سے بھی انجام پاسکتا ہے۔ ضرورت انھیں متحرک کرنے کی ہے۔

تعمیرِ ملّت میں مفکّر اور مصنّف کا مقام

ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایک قوم اور ایک ملّت کی تعمیر میں اور ترقی میں سب سے اہم کردار جو طبقہ ادا کرتا ہے وہ مفکرین اور مصنفین کا طبقہ ہے۔ یہی ملّت کے دل و دماغ میں افکار تازہ پیدا کرتا ہے اور یہی حیات تازہ کا درس دیتا ہے۔ یہی آزادیٔ فکر و عمل کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ مفکرین اور مصنفین کے افکار عالیہ سے تشخص ملّی کا سرور پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اسی ملّت کا بول بالا ہوا جس نے اپنے مفکرین کے مقام بلند کو پہچان کر ان کے عز و احترام کو پوری پوری اہمیت دی۔ ہر اس ملّت نے سرِ افتخار بلند کیا ہے جس کے اہل فکر و نظر اور مصنفین کو معاشرے میں قرار واقعی مقام حاصل رہا۔ آپ تاریخ ماضی بعید و قریب کو بھی دیکھیے اور آج کے دور پر بھی نگاہ ڈالیے۔ آپ ان کو میری تائید میں پائیں گے۔

اس کے برعکس ایسی اقوام و ملل بھی رہی ہیں اور آج بھی ہیں جو اپنی قطعی بدنصیبی کی بنا پر خودی سے محروم ہو گئیں۔ انھوں نے اپنی ہر چیز کو حقیر جانا اور اپنے ہر ورثے سے صرف نظر کیا۔ انھوں نے اپنی روایات، تہذیب، تمدن کو چھوڑا اور اپنے اہل فکر و نظر کو حقیر جانا۔

ایسی بدنصیب اقوام تمام ادوار میں صرف ذلیل و خوار ہوئیں۔ ذلت اور بے آبروئی ان کا مقدر ہوئی۔ ایسی اقوام و ملل کہ جنھوں نے اپنی خودی کو خیرباد کہا اقوام عالم میں ان کا کوئی مقام نہیں رہا۔ ایسی بدنصیب اقوام و ملل پر افکار غیر غالب آجایا کرتے ہیں اور وہ اپنے تشخص ملّی سے محروم ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسی قومیں ان اقوام مردہ کی طرح ہوتی ہیں جن کو زندہ اقوام تہ و بالا کر دیا کرتی ہیں۔ ایسی قوم کے کبھی کوئی دوسرا ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور کبھی وہ آپس میں لڑ جاتی ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسی اقوام اپنی منزل سے بھٹک جایا کرتی ہیں، حتیٰ کہ ان کی کوئی منزل مقصود نہیں ہوتی۔

اگر یہ حال ہمارا بھی ہے تو ہمیں آج اور فوراً اس سنگین صورت حال پر غور کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے اہل فکر و نظر سے صرف نظر کیا اور ان کے احترام نہ کرنے کی غلطی کی تو اس کی پاداش میں ہم جو نقصان

اٹھا چکے اس پر غور کرنا چاہیے اور تلافی مافات کی جد وجہد کرنی چاہیے۔
ہمارے پاکستان میں اہل فکر ونظر کی کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ گو ہم نے ان سے متعلق اپنے جذبات کو سرد کر دیا ہے اس کے باوجود اس چنگاری کو آگ بنایا جا سکتا ہے۔ اس نور سے اب بھی پاکستان کو حرارت اور روشنی پہنچائی جا سکتی ہے۔ ایسا کرنے کے لیے قیادت کو دیانت دار اور امانت دار ہونا چاہیے۔ اقتدار کو نظریۂ پاکستان کی روشنی میں اپنی راہ متعین کرنی چاہیے۔ اور صحیح اور سچے افکار کو زندہ رہنے کا ماحول فراہم کرنا چاہیے۔ ہم اس کے بغیر موجودہ ذلت کی زندگی سے ہرگز نہیں نکل سکتے۔ ہمیں یہ ذلت کی زندگی ہرگز پسند نہیں جس میں ہمارا ہر فعل تابع مرضی غیر ہو۔ یہ پاکستان کی موت کے مترادف ہوگا۔

پاکستان میں اردو ادب

دنیا ہمیشہ سے تغیر پذیر ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے فکری رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آج کا یہ دور جو ہمارے مقدر میں ہے اپنی اس خصوصیت میں نمایاں ہے کہ اس نے تغیر و تبدل کو بہت بڑھا دیا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ تشویش ناک حد تک بڑھا دیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ سائنس اور رسل و رسائل کی ترقی نے دنیا کی طنابیں کھینچ لیں اور کرۂ ارض سکڑ اور سمٹ کر اتنا مختصر ہوگیا ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک سے اور ایک قوم دوسری قوم سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی قوم خواہ تیز رفتاری میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو، لیکن وہ مجموعی بہاؤ سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتی۔ جو افراد یا اقوام اپنے عہد کو سمجھنے میں ذرا پیچھے ہیں ان کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس تیز بہاؤ کا ایک اثر ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ سائنسی پیش رفت خصوصاً ذرائع ابلاغ کی نئی نئی جدتوں نے بہت سے لوگوں کو ادب کے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا ہے۔ ہمارے ملک میں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے فروغ نے مطالعے کی رہی سہی عادت کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ادبی کتابوں کی فروخت اور بھی کم ہوگئی اور اب ان کتابوں کی اشاعت تقریبات کے سہارے ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ادب کا مطالعہ اور زیادہ سمٹ جائے گا اور آنے والا کل پاکستانی ادب کے لیے موجودہ حالات سے بھی زیادہ آزمائش کا ہوگا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ یہ سوال محض ادیبوں کے مستقبل کا ہی نہیں بلکہ تہذیب کی بقا کا بھی سوال ہے۔ پھر آج جس طرح نئی نسل وی سی آر کے جال میں اُلجھ گئی اس کے پیش نظر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سنجیدہ ادب کے مطالعے کے لیے اپنے وقت اور توانائی کا کوئی حصہ صرف کر سکے گی، شاید زیادہ دانش مندانہ رویّہ قرار نہ دیا جا سکے۔

ہمارا ادب ہماری روایات اور تہذیبی میراث کا امین ہے۔ ہماری تاریخی جدوجہد اور جہادِ آزادی کا ریکارڈ ہے۔ ہماری اجتماعی امنگوں اور قومی عزائم کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے ماضی، حال

اور مستقبل بھی ادب ہی کے ذریعے سے مربوط ہیں اور اس طرح ادب قومی تشخص کا اہم حصہ ہے۔ ہمیں اپنے ادب کے مستقبل کے بارے میں ممکنہ سوالات پر انتہائی درد مندی اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے ادیب پاکستانی اردو ادب کے حوالے سے قوم کی رہ نمائی اور خدمت کی طرف توجہ دیتے رہیں گے۔

ادب اور رسائل

محبّت ایک سچائی ہے ، اتنی بڑی سچائی کہ ادب کی تخلیق میں اس کا بڑا دخل ہے۔ زندگی سے محبّت ہی کی بنا پر ادب تخلیق ہوتا ہے۔ ادب ایک ایسا عمل ہے جو زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے اور تعمیر بھی۔ ادب زندگی کی ترتیب وتطہیر کا وسیلہ ہے۔ زندگی کے حسن کو نکھارنا اور اس کی دل کشی میں اضافہ کرنا ادب کے تخلیقی عمل میں شامل ہے۔ ادب کا یہ عمل فکر کے نئے سانچے اور خیال کی نئی راہیں وجود میں لاتا ہے جن سے زندگی کی محبت اور انسان کی عظمت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ ادب زندگی اور معاشرے کے احساسات، رجحانات اور جذبات کا ترجمان ہوتا ہے، لیکن یہ ترجمانی غیر مہذب طریقے سے نہیں ہوتی بلکہ دائمی اقدار کے ساتھ ادب کے رشتنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ معاشرے میں پائی جانے والی خوبیوں اور خامیوں کو ادیب آئینہ دکھاتا ہے۔ ادب کا آئینہ صحافت کے آئینے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب کو بعض اوقات بُرائی میں بھی خوبی کا پہلو نظر آجاتا ہے اور وہ نامعقولیت میں بھی معقولیت کا ادراک کرلیتا ہے۔ ادیب کو زندگی عزیز ہوتی ہے۔ اپنی زندگی سے زیادہ اُسے اپنے عہد کی زندگی اور انسان کی زندگی محبوب ہوتی ہے۔ اعلا اقدار اور افکار و خیالات کی زندگی سے اسے محبت ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ مجھے ماضی عزیز ہے یا میں مستقبل میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا جواب ہوتا ہے کہ میں ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی پر اعتماد رکھتا ہوں۔ اس بات کے بیان میں رشید صاحب کے الفاظ شاید کچھ مختلف ہوں، لیکن اُن کا مفہوم یہی نکلتا ہے۔ انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں بتایا ہے کہ "حال" زیادہ اہم ہے۔ ماضی کی عظمت اور مستقبل کی امیدوں کی اصل اہمیت کا تعلق بھی حال ہی سے ہے۔ ادیب ماضی سے روشنی حاصل کرتا ہے، اس کی پوجا نہیں کرتا۔ اسی طرح بہتر مستقبل کی تلاش تو ادب میں منعکس ہوتی ہے، لیکن مستقبل کا ایسا انتظار جو مایوسی اور بے عملی کو دعوت دے، ادب میں جگہ نہیں پاتا۔ حال سے واضح رشتے کے باوجود ادب وقتی نہیں ہوتا اور نہ محض تفریح کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سیاست،

سائنس اور معیشت کی طرح ادب ہماری زندگی پر راست اثرانداز نہیں ہوتا۔ ادب اپنے قاری پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ اثرات عملی طور پر ہماری زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور زندگی کے حسن اور برکات والطاف سے مستفید ہونے کی فضا تیار کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو سیاست داں اور سائنس داں بھی ادب کے مطالعے کے بغیر فکر وعمل کی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاسکتے۔ جو تہذیب سیاست و سائنس کو بلند مرتبہ بخشتی ہے اور جس تہذیب کو سیاست وسائنس نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں وہ تہذیب ادب کے توسط ہی سے اپنا چہرہ نکھارتی ہے۔

ادب اور ادیب کے کردار پر اس مختصر گفت گو کے بعد ادبی رسالوں کی اہمیت پر بھی نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ ادب کی اشاعت کا پہلا مرحلہ ادبی رسائل کے ذریعے ہی سے طے ہوتا ہے۔ خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں، جہاں اشاعتی وطباعتی وسائل کی ترقی کے باوجود ابھی کتابوں کو محفوظ رکھنے کا انتظام اور بڑے پیمانے پر اشاعت ممکن نہیں ہوسکی ہے، وہاں ادبی رسالوں کی اہمیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ رسائل ادیب اور قاری کے درمیان ایک تیز رفتار رابطے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں۔ یہ ایک طرف لکھنے والوں کو سوچنے اور لکھنے پر ابھارتے ہیں تو دوسری طرف پڑھنے والوں کو تازہ بہ تازہ فکری رجحانات اور ادبی موضوعات سے باخبر رکھتے ہیں۔ نئے رجحانات سے بہت سے قابل اور متبحر عالموں کی بے خبری دنیا کو ان کے لیے اجنبی بنا دیتی ہے۔ قدیم وجدید علوم و افکار کے درمیان بُعد کو دور کرنے کے لیے رسائل کا مطالعہ ایک پُل کا کام انجام دیتا ہے۔ رسائل سے نئی کتابوں اور ان کے ادبی استناد پر نقادوں کی تنقید اور پڑھنے والوں کی بحثوں سے اعلا ادب کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور مطالعے کا ذوق تربیت پاتا ہے۔

ایک اور اہم کردار جو میرے خیال میں ادبی رسائل انجام دیتے ہیں وہ ادیبوں کو خود تنقیدی اور خود احتسابی کا موقع فراہم کرنا ہے۔ ادبی تخلیقات کی فوری اشاعت اور نقّادوں اور پڑھنے والوں پر اس کا ردعمل ادیب کے فکر و خیال کے بہت سے گوشوں کو جلا بخشتا ہے اور اس کو اظہار و ابلاغ کے نئے سانچے فراہم کرتا ہے۔ یہ کام بھی رسائل بہ خوبی انجام دیتے ہیں اور رسائل کے خصوصی شمارے خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں سے متعلق شخصیات نمبر ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔

ماہ نامہ "افکار" جس کی آج ہم تینتیسویں سال گرہ منا رہے ہیں ان رسالوں میں سے ہے جن کا میں اکثر مطالعہ کرتا رہا ہوں اور جن کی رفتار و معیار کو بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ میری رائے میں رسالے کا معیار بڑھانا اتنا مشکل نہیں جتنا مشکل معیار کو قائم رکھنا ہے۔ جناب صہبا لکھنوی نے اپنی سبک روی اور تلون مزاج سے افکار کے معیار کو ہمیشہ

برقرار رکھا۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ افکار کے خصوصی شمارے جن میں جوش، فیض اور حفیظ جیسے شاعروں کے نمبر شامل ہیں، ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں کتابوں اور رسائل کے مطالعے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ کتابیں چھپتی ہیں اور گوداموں یا الماریوں کی زینت بنی رہتی ہیں، رسائل اخبارات کے ساتھ ردی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں بہت کم رسالے اپنی زندگی جاری رکھ سکے اور بہت جلد ناپید ہو گئے۔ جن رسالوں نے خسارے کے سودے کو نباہا وہ سہ ماہی اردو، مخزن، عالمگیر، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، اردوئے معلیٰ، زمانہ، نگار، نقوش، معارف، نیا دور، ماہ نو، فنون، اوراق، ادب لطیف، سیپ اور ساقی کی طرح ادبی روایت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

صہبا صاحب کا تن تنہا تینتیس سال تک افکار کو زندہ رکھنا اُن کی ادب سے محبت اور مستقل مزاجی کا اعتراف کرالیتا ہے۔

رسائل کی اہمیت

اہلِ علم، اہلِ قلم اور اصحابِ ذوق ہماری تہذیبی زندگی کے خوب صورت نقوش ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک وملّت کے معمار، معاشرے کے ستون اور ملّت کے محسن ہیں۔ ان کا کام اچھی زندگی کی تعمیر معاشرے کی تطہیر اور حسن کی تخلیق ہے۔ یہ اہلِ قلم ہی ہیں جو ہمیں خیال کے نئے سانچے، فکر کے نئے زاویے اور علم کے نئے راستے عطا کرتے ہیں۔ ان ہی کی تحریروں سے انسان کی عظمت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ یہی فرد کو اس کے فرائض سے آگاہ کرتے اور معاشرے کو اس کی ذمے داریاں یاد دلاتے ہیں۔ یہی انسانی احساسات وجذبات کی ترجمانی اور سماجی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ ادب کا عمل سیاست، سائنس اور معیشت کی طرح معاشرے پر راست اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن اس کے اثرات غیر مرئی ہوتے ہیں اور ادیب کی عطا کی ہوئی دانش، اس کا تخلیق کردہ احساسِ حسن اور اس کا پیش کیا ہوا معیارِ خیر ہر چیز اور ہر عمل میں کار فرما نظر آتا ہے۔ سائنس سے لے کر صنعت تک، تعلیم سے لے کر تجارت تک اور ثقافت سے لے کر سیاست تک ہر شعبۂ زندگی ادب سے متاثر ہوتا ہے اور ادب کا محتاج ہے۔

ادب کو عام آدمی تک پہنچانے کے ذرائع یوں تو اور بھی ہیں اور ان میں کتابیں بہت اہم ہیں، لیکن سب سے پہلا اور عام ذریعہ رسالے ہیں۔ ادب کی اشاعت کا اوّلین مرحلہ رسائل کے ذریعے ہی سے طے ہوتا ہے۔ یہ علمی، ادبی اور فنی رسائل ہی ہیں جو ادیبوں کی فکر و دانش کو تیزی سے سنجیدہ قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ ادیب اور قاری کے درمیان سبک رفتار رابطے کا کردار رسائل ہی انجام دیتے ہیں۔ یہ ایک طرف لکھنے والوں کو سوچنے اور لکھنے پر آمادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف پڑھنے والوں کو تازہ بہ تازہ فکری رجحانات سے باخبر رکھتے اور مسائلِ ملّی سے آگاہ کرتے ہیں۔ مسائل کی شدت اور ان کے حل میں حائل مشکلات سے ایک سنجیدہ قاری پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور یہ آگہی اس کو اکثر صورتوں میں رسائل ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ رسائل ہی پرانے اور نئے ذہن کے درمیان بُعد کو دور

کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ بعض صورتوں میں یہ بُعد پھر بھی ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر دونوں طرح کے ذہنوں کے درمیان رسائل کا پُل نہ ہو تو شاید مسائل زیادہ سنگین ہو جائیں۔ اسی طرح قدیم و جدید علوم کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں بھی رسائل ہی معاون ہوتے ہیں۔

نہ صرف دنیا کی تاریخ میں بلکہ خود برصغیر میں ہم نے دیکھا ہے کہ اصلاح اور بیداری میں رسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خود تحریک آزادی کا آغاز اور استحکام بھی رسائل ہی کا مرہون منت ہے۔ میں شخصیات کی نفی نہیں کر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ ساز رسائل کی پشت پر مضبوط شخصیات کارفرما ہوتی ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان شخصیات کو منوانے اور قبول عام کرنے کا کام بھی رسائل ہی انجام دیتے ہیں۔

قومی زندگی کے لیے رسائل کا وجود بہت اہم ہے اس لیے ان کی زندگی کا تحفّظ معاشرے پر لازم ہے۔ رسائل کی زندگی اور ترقی کی راہ میں بہت سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جن میں عام گرانی، کاغذ کی نایابی، اشتہارات کی کم یابی اور حکومت کی بے التفاتی سے لے کر قاری کی عدم دلچسپی تک مسائل ہی مسائل ہیں۔ ان کا ایک خطرناک بلکہ خوفناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض رسائل بددل ہو کر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ان میں صحت مند بنیادوں کے بجائے محض تجارتی بنیادوں پر باہمی مقابلہ ہونے لگتا ہے اور رسائل کو وہ جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا کوئی الٹا سیدھا نہیں۔ ایسے رسائل دیگر علمی، ادبی اور فنی رسائل کے مسائل میں ایک اور مسئلے کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسے مایوس و گم کردہ راہ رسائل ادبی رسائل کے رہے سہے قارئین بھی چھیننے شروع کر دیتے ہیں اور قارئین کے ساتھ ساتھ اشتہارات بھی کم ہو جاتے ہیں اور معاشرے کی بے نیازی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ادبی دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہتی جو اہل قلم ہونے کے رشتے سے رسائل کے معیار کو برقرار رکھنے میں زندگیاں صرف کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

علم وادب اور تعلیم و تعلّم

علم وادب اور تعلیم و تعلّم کے حقیقی مقصد اور غایت و نوعیت کے بجائے اُن کے بارے میں ایک غلط تصور قائم کرنے کی بنا پر بہت سے افراد شدید گمراہی اور مہلک غلط کاموں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ غلط تصوّر اس صورت میں قائم ہوتا ہے کہ جب تربیتِ عقل کی کوشش میں دل کی درستی اور مقاصد اور نظریات ملّی و ملکی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وقتی مفاد کے شوق میں دائمی مفاد کو قربان کر دیا جاتا ہے یعنی خیر کلُ کے اعلا مقصد کی جگہ خود غرضی کو اپنا لیا جاتا ہے۔ یہ خواہش اپنی جگہ بجا و درست ہے کہ جوانوں اور ادیبوں کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملنا چاہیے تاکہ وہ امکانی حد تک بلندیوں کو چھو سکیں۔ ہم بھی تعلیم پر پہرہ نہیں بٹھانا چاہتے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی تعلیم کو محدود نہیں کیا، لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے تمام اکتسابات علمیہ بیکار محض ہوں گے اگر ہم ان سے اللہ اور اس کے مشن کی سربلندی اور انسانیت کی حقیقی بہبود کے لیے کوئی خدمت نہ لے سکیں۔ اگر ہمارا علم وہ سیڑھی نہیں ہے کہ جس کے توسط سے ہم مقاصد کے بام پر پہنچ سکیں اور ہمارا ادب ایسا نہیں ہے کہ جس کے اثرات سے ہم افرادِ ملّت میں تشخص ملّی اور نظریۂ حیات کی حقیقت کا شعور پیدا کر سکیں تو نہ وہ ادب کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ وہ علم کوڑی برابر کام کا ہے۔

آج بہت سے اسکولوں اور کالجوں میں سائنسی تحقیقات سے جو نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اور اس کو جس طور سے سکھایا، پڑھایا اور ذہن میں اتارا جاتا ہے نیز اس سے جو نقوش طالب علم کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں، اس سے طالب علم اور کشش و پیچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس نے سائنس سے جو سیکھا ہے اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر یہ مذہبی لٹریچر اور صحائف سماوی قطعاً غلط معلوم ہوتے ہیں۔ شک و شبہات کے یہ کانٹے اپنا بھیس بدلے ہوئے سائنس کے پھولوں کی آب و تاب اور تازگی و شادابی میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

انسانی دماغ کے لیے شک و شبہات میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ اس میں جوان دل کو اس گرفت

سے آزادی نظر آتی ہے جو اس کی فکر پر مسلط ہو کر اس کو جکڑے اور مقید کیے ہوئے ہوتی ہے۔ انسان کے اندر نفسِ امّارہ ایسی طاقت ہے جو اس کو فطری شہوات و مطالبات کی طرف پوری قوّت سے کھینچتا رہتا ہے۔ وہ بہت آسانی و آمادگی اور بڑے شوق و ذوق کے ساتھ نفس کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ اس کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ انسان نفس سے مقابلہ کرکے اور اس پر غالب آکر ہی انسان بن سکتا ہے ورنہ اس کی حقیقت محض ایک حیوان سے زیادہ نہیں۔ شیطان جو ہر وقت انسان کو گم راہ کرنے کی تاک میں رہتا ہے، اس شک کی جڑ ہوتا ہے اور سائنسی اکتسابات و فتوحات کے دیے ہوئے غلط تصوّر اس کے لیے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شک کے ہر تخم کی نوجوان دل میں آبیاری کرتے ہیں اور نفس ان کا معاون ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کفر و الحاد کی لہلہاتی فصل تیار ہو جاتی ہے۔

اس روشنی میں ہمیں ادب و ادیب کا بھی بھرپور جائزہ لینا چاہیے اور مظاہرِ علم و ادب یعنی جرائد و رسائل اور ادبی تحقیقات پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے، بلکہ ایسی نگاہ ڈالنی چاہیے کہ جو تعمیر و تخریب میں امتیاز کی پوری طرح اہل ہو اور قطعی طور پر حقیقت شناس ہو۔ یہ نگاہِ حقیقت شناس خود اس عظیم انسان کی بھی ہوتی ہے کہ جو ادب تخلیق کرتا ہے اور تعمیرِ اذہان جس کا نقطۂ فکر و نظر ہوتا ہے۔ یہ وہ ادیب ہوتا ہے کہ جو نہ صرف ملّت کے ہر فرد سے والہانہ محبّت کرتا ہے بلکہ جسے نظریۂ حیاتِ ملی ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور جو تشخص ملی کی اساس و بنیاد رکھ کر اس پر وہ قصرِ رفیع تعمیر کرتا ہے جس سے ہر طرف روشنی اور نور پھیلتا ہے۔

لیکن جب علم و ادب تخریب کی طاقتوں کو جنم دینے لگیں اور نظریاتی قلعوں کو مسمار اور تباہ کرنے لگیں، بہ الفاظ صحیح جب ادیب کا قلم فروخت ہو جائے اور اس کا ضمیر بک جائے تو اس وقت قوّتِ حاکمہ کو پوری طاقت کے ساتھ حرکت میں آجانا چاہیے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ ضمیر و قلم کو ان اغیار نے خرید لیا جو اسلام اور ملّت کے خلاف ہیں، قوم کی شرافت و ثقافت کو تباہ کرنا جن کا مقصدِ اعلا ہے اور ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا جن کا مقصود ہے تو قوّتِ حاکمہ کو طاقت کے ساتھ طیش و جلال کو بھی شریک کرنا چاہیے اور ایسے ادب و ادیب کی ہر طاقت کو سلب کر لینا چاہیے، مگر ایسا کرنے کے لیے قوّتِ حاکمہ کو بھی قطعی طور پر دیانت دار ہونا چاہیے اور اس کے ایمان و ایقان میں کوئی بھی فتور نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ بددیانتی اور بے ایمانی کی آغوش میں حریتِ فکر دم توڑ دیا کرتی ہے اور سیاسی آزادی کا خاتمہ ہو جایا کرتا ہے۔

پاکستانی ملّت اور بالخصوص ہمارے نوجوانوں کے دماغ میں اس قسم کی گندگی ہمارے لیے بہت نقصان رساں ہے، کیوں کہ مستقبل میں کام چلانے کے لیے ہمارا انحصار انھی پر ہے۔ ان

کے لیے سائنس کی تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں سنوارنے اور سائنس کی لا دینی توجیہات و تفریحات سے اُن کے دماغوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے ہم پر کچھ ذمّے داری بھی عائد ہوتی ہے۔ صحیح تعلیم کی بھی ایک سائنس ہے اور وہ سائنسی صداقت اور اس کی شناخت ہے۔ اس تعلیم کو طلبہ کی روح اور ان کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں اور پیوست کر دینا لازمی ہے کہ وہ تعلیم ان غلط بیانیوں اور بے راہ رویوں کی وجہ سے ذہنوں سے محو نہ ہو سکے جو ہر طرف سے طلبہ کو گھیرے ہوئے اور ان کی نظروں میں چکا چوند پیدا کیے ہوئے ہے۔

خواہ بوڑھے ہوں یا جوان زندگی کا صحیح نصب العین سب کے سامنے ہونا چاہیے۔ انھیں اس طور سے تعلیم دی جانی چاہیے کہ جو خود ان کے اور دوسروں کے لیے خیر و برکت ثابت ہو، دنیا جس تباہی کی طرف دوڑی جارہی ہے وہ اس سے رک جائے اور بداعمالی اور دہشت اور جنسی درماندگی کا جو طوفان بے راہ رو ادب و علم ، ملکی اور خصوصاً غیر ملکی بلیو فلموں ٹیلی وژن اور غیر معیاری ڈائجسٹوں کے ذریعے سے امڈا چلا آرہا ہے اس کے خلاف بند باندھا جا سکے۔ طلبہ اور طالبات کی روحیں پاک اور ان کے کردار بے عیب ہوں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔ سچے ادیب اور باضمیر اہلِ قلم ہی ملت کو سکھا سکتے ہیں کہ صلاحیتوں کے استعمال کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ جسم اور دماغ دونوں کی تربیت پر یکساں زور دیا جانا ضروری ہے۔ یہ بھی بتایا جانا چاہیے کہ نیک چلنی تن درستی کی ضامن ہے اور جسمانی، اخلاقی اور روحانی طاقت کے حصول کے لیے عادات و اطوار میں نظم و ضبط ضروری ہے۔ صداقت اور باطنی طہارت بجائے خود ایک بڑی طاقت ہے جس کے سامنے دوسری تمام طاقتیں جلد یا بہ دیر گردن جھکا دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب کسی ملک و قوم میں وہ صفات عام ہو جائیں۔ ان کو عام کرنا علم و ادب اور تعلیم و تعلّم کا اولین مقصد ہے۔ اللہ سے سچّی وابستگی، اس پر سچا اعتقاد و اعتماد اور اس کی فرماں برداری ہر انسان کا نصب العین اور مقصدِ حیات ہونا چاہیے۔

صحیح تعلیم وہ ہے جو اللہ کی ذات کو ملت کے ہر فرد کے دل میں بسا دے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو نفس کی سرکشی اور شیطان کی سرگوشی بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہماری جوان نسل میں یہ بات پیدا ہو گئی تو پھر ان کی کامیابی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اسکولوں کی ارضی اور مادی تعلیم کے ماسوا ایک تعلیم اور بھی ہے جو روح کو طاقت دیتی اور انسان کو مادیت سے بے نیاز کر کے فرشتوں کا ہم نشین بنا دیتی ہے اور ان جیسی طاقت عطا کرتی ہے۔ روح اللہ کی آواز براہِ راست سن سکتی ہے۔ انسان خود اللہ سے تعلیم لینے لگتا ہے۔ یہ تعلیم کٹھن ضرور ہے۔ اس میں

نفس اور شیطان سے نہایت سخت جنگ کرنی پڑتی ہے، لیکن اُس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ یہ تعلیم ہم کو سکھاتی ہے کہ فرائض کی بجا آوری بجائے خود لذت بخش ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعلیم کے دوران ہم کو آنسو بہانا اور اذیتیں سہنا پڑیں، لیکن یہ آزار ہی مردانِ حق کے لیے اصل حیات ہوتا ہے۔ اسی ریاضت کے ذریعے سے انسان آفاق و افلاک کو سر کرتا ہے۔ ان بلندیوں تک کسی راکٹ کی رسائی نہیں ہوتی اور کوئی رکاوٹ اس راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔ حرص و ہوس کی گھاٹی کو سلامتی کے ساتھ عبور کرکے آزمائشوں اور مشکلات کو سر کرتے ہوئے ہم ایک ایسے عالم میں پہنچ سکتے ہیں کہ جس کے سامنے دنیا کی شان و شوکت، ہیچ ہے۔ جو لوگ اس الٰہی تعلیم سے گریز کرکے حقیر چیزوں کے مطالعے میں کھو جاتے ہیں وہ بڑے گھاٹے میں ہیں۔

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

علم سے حرص و ہوس کا کام لینا علم کی توہین ہے۔ جو شخص حرص و ہوس سے آزاد ہوجاتا ہے اس کو حکمرانی کا منصب خود بہ خود حاصل ہوجاتا ہے۔ اس منصب کے مزے اور اختیار سے وہی لوگ خوب واقف ہوتے ہیں جو اس پر فائز ہوچکے ہوں۔ ہر وہ وصف اور صلاحیت جو اللہ کی طرف سے انسان کو ودیعت کی گئی ہے اللہ کی شان کو بلند کرنے میں صرف ہونی چاہیے اور اس کی اطاعت میں کام آنی چاہیے۔ مقدس ترین، بلند ترین اور خوش ترین کام وہی ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم کو اسی کا بنا رہنا چاہیے۔ اللہ کے قانون کو ہماری زندگی پر پوری طرح نافذ و غالب رہنا چاہیے۔ ہم کو مسلسل اسی کی طرف چلتے رہنا چاہیے، کیوں کہ بالآخر ہم کو اسی کے پاس جانا ہے۔ تو پھر ہم اس کے سامنے سرخ روئی کے ساتھ کیوں نہ پیش ہوں اور دوڑ کر اس کی طرف کیوں نہ چلیں۔

ادیب و عالم کے ساتھ ساتھ اربابِ اختیار پر بھی یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جوان نسل کو، جو ان کی تحویل میں دی گئی ہے، اس علم سے بہرہ ور کریں جو ازل و ابد کی خبر دیتا ہے اور غیب کی وہ باتیں سکھاتا ہے جس کی خود اللہ نے تعلیم دی ہے۔ اُن کے خدا داد جسم و ذہن، وقت اور صلاحیتوں کو ہرگز ایسے کاموں میں مشغول ہونے کی اجازت نہ دیں جو ان کو اللہ سے توڑنے اور جدا کرنے کا موجب ہوں۔

اس موقع پر مجھے اس علم و ادب کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے کہ جو غیر اسلامی عقائد اور غیر ملکی نظریات اور غیر انسانی محرکات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ملک میں درآمد ہوتا ہے اور بلا تکان و قدغن خود ملک میں جنم لیتا ہے۔ یہ علم و ادب ملّتِ اسلامیہ کے نظریات سے بہ شدت متصادم ہے

اور اللہ اور رسولؐ کی نفی کرتا ہے۔ اس بارے میں ہماری وسیع القلبی اور فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ ہم حکومتِ اسلامیہ میں اس کی تبلیغ واشاعت پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتے۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ سچا علم اور حقیقی ادب قانون کی بندشوں اور طاقت کے ڈنڈوں سے جنم نہیں لیا کرتا۔ عالم اور ادیب پر عرصۂ حیات تنگ کر کے یا اس کے قلم وضمیر کو خرید کر اس سے حقائق بیان نہیں کرائے جا سکتے۔ میری رائے یہ ہے کہ پاکستانی ادیبوں کو اور اہلِ فکرونظر کو پوری آزادی دینی چاہیے اور ان کو لالچ دینے کی ہر کوشش کی پُرزور مذمت کرنی چاہیے۔ ان کی حقیقی مدد کرنی چاہیے اور ان کی بے لوث خدمت کرنی چاہیے۔ اُن کو فکرِ معاش سے آزاد کرنا چاہیے مگر اس کی قیمت کا مطالبہ ہم نوائی کی شکل میں ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ ادب مردہ ہو جائے گا اور ادیب مرجھا جائے گا۔ پاکستان میں شروع سے آج تک یہ غلطیاں ہو رہی ہیں اس لیے شاعر مدح خواں ہو گیا اور صاحبِ قلم میراثی بن گیا۔ اس طرح پاکستان میں فکروادب پر جمود طاری ہو گیا۔ اس جمود سے اسے بچانا چاہیے۔

اہلِ دانش کا فرض

پاکستان میں مطالعۂ تاریخ کے بعض پہلو ایسے ہیں جو معاشرتی، قومی، ادبی اور دینی نقطہ ہاے نظر سے بہت اہم ہیں اور ہم ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اسلام نے انسانی زندگی اور اس کے مقصد کا جو تصوّر پیش کیا ہے، اس کا نمایاں اور بنیادی پہلو مادیت اور روحانیت کا امتزاج اور ان کی متوازن ہم آہنگی ہے۔ اس کی لغت میں نہ خالص سیکولرازم کے لیے کوئی گنجائش ہے اور نہ رہبانیت کے لیے۔ اس کے تصوّر زندگی میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور یادِ الٰہی بھی عبادت ہے اور اللہ کی راہ میں وقت ضرورت جہاد بھی عبادت میں شامل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس پر نظر ڈالیے۔ آں حضرتؐ کو جس طرح آپ شب بیداری اور یادِ الٰہی میں مصروف پائیں گے اسی طرح بدر و حنین میں مجاہدین کی کمان کرتے ہوئے اور مدینے کے دفاع کے لیے صحابہؓ کے ساتھ خندق کھودتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے بعد خلفاے راشدینؓ نے بھی خلافت (جدید اصطلاح میں اسلامک اسٹیٹ) کو طریقت نبوت ہی پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ برصغیر کے عظیم مفکر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے خلافت کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے اس نظریے کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے اور یہی سبب تھا کہ صحابۂ کبارؓ نے خلیفہ کے انتخاب اور قیام کا مسئلہ تجہیز و تکفین پیغمبرؐ سے پہلے حل کیا۔

میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس وقت اسلامی حکومت کا قیام پاکستان کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ ہمیں اسلامی حکومت ہر قیمت پر قائم کرنی ہے۔ پاکستان اسلامی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دو قومی نظریے پر برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ اسی بنیاد پر پیش کیا گیا تھا۔ بعض غیر مسلم مورخین اور کچھ مسلمان بھی غیر ملکی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اور تاریخی حقائق سے لاعلمی یا محدود واقفیت کے باعث ان نظریات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں مسلم محققین و مورخین کا یہ نہایت اہم فرض ہے کہ وہ تاریخ

برصغیر کے ان اہم ابواب کا تجزیہ ان حقائق کی روشنی میں کریں۔ ہمارے نوجوان طبقے کو ہر ذریعے سے یہ یاد دلانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ دو قومی نظریے اور اسلامی نظریے سے کیا مطلب ہے ؟ اس کا تاریخی پس منظر اور اس کا مقصد کیا ہے ؟ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہم نے تخلیق پاکستان کے بعد ان نظریات کی اہمیت کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔ ہمارے تعلیمی نصاب اور سلسلۂ تدریس میں اس کو وہ مقام حاصل نہ ہوا جو ضروری اور لازمی تھا۔ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ کو علاقائیت، صوبائی خود مختاری اور لسانی یک جہتی جیسے نظریات کا درس ملتا رہا اور ان کے دماغوں میں وہی خیالات جاگزیں ہوتے رہے جو ان کا منطقی نتیجہ ہو سکتے تھے۔ میں واقعات ماضی کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، لیکن یہ بتلانا ضروری ہے کہ اس لحاظ سے ہماری تعلیم ناقص رہی اور اس سے پاکستان کو عظیم نقصان پہنچا۔

ہمیں چاہیے کہ اس سے سبق حاصل کریں اور آئندہ نسلوں کو حقائق کے مطالعے اور ان کی اہمیت سمجھنے سے محروم نہ رہنے دیں۔ اس سلسلے میں ہمارے محققین اور مورخین نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جو حضرات یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں درس دیتے ہیں اور تصنیف و تالیف کے کام میں بھی مصروف ہیں ان کو ایسے مواقع فراہم ہیں جن سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنے شاگردوں کو صحیح خطوط پر سوچنے کی تربیت دے سکتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے اور تحریر کے لیے سچائی اور حقیقت پسندی نہایت اہم بلکہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ایک مورخ اور محقق کو اس حیثیت سے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ واقعات کی بنیاد پر کن نتائج پر پہنچے اور کیا اصول قائم کرے۔ مغربی مستشرقین نے ہماری تاریخ اور سیاسی تصورات کو انھی اختیارات کی بدولت اس قدر مسخ شدہ حالت میں پیش کیا ہے کہ تقریباً اس کے ہر باب اور ہر مسئلے کا از سرِ نو مطالعہ اور تجزیہ ضروری ہو گیا۔

اسلامی ریاست کا جو تصوّر ہمارے ذہنوں میں ہے اور جو اسلامی معاشرے کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس کی عملی شکل مغربی محققین کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتی۔ طرح طرح کے شکوک اور وساوس ان کے خیالات میں راہ پاتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ اس کو قطع ید اور کوڑے لگانے تک محدود کر دیتے ہیں اور کبھی وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تھیاکریسی ("مُلّاؤں" کی حکومت) ہو گی۔ ملّا اور عالم دین جیسی اصطلاحات سے وہ اس لیے خائف رہتے ہیں کہ ان کو اسلامی معاشرے میں ان لوگوں کی حیثیت اور مقام کا صحیح اندازہ نہیں۔ وہ ان کو دوسرے مذاہب میں پادری و پروہت کا مترادف خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ عہدے اسلامی تعلیمات کی روح اور بنیادی اصولوں کی ضد ہیں اور کسی حیثیت سے اسلام میں ان کی گنجائش نہیں۔ ہم اسلامی علوم سے متصف اور ان میں مستند مقام رکھنے والوں کو یہ القاب دیتے ہیں۔

مطالعۂ اسلام کے سلسلے میں مستشرقین کی گم راہی اور غلط روی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ وہ الفاظ و اصطلاحات اور مسلمانوں کی تاریخ کے بعض واقعات کو بنیادی حیثیت دے کر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لازمی طور پر یہ غلط اور ہمارے نقطۂ نظر سے گم راہ کن ہوتے ہیں۔ ہمیں ان حضرات میں سے اکثر کی نیت اور مقصد سے بدگمان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یقیناً ان میں ایسے محققین زیادہ ہیں جو خلوص نیت اور انتہائی محنت و جاں فشانی سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن جن تصورات اور طریقوں پر وہ عمل پیرا ہیں ان سے نتائج وہ ہی نکلیں گے جو اب تک نکلتے رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ کی توجہ برنارڈ لیوس (BERNARD LEWIS) کے اس مقالے کی طرف مبذول کراتا ہوں جو THE CONCEPT OF AN ISLAMIC REPUBLIC کے عنوان سے NATIONAL COMMITTEE FOR BIRTH CENTENARY CELEBRATION OF QUAID-I-AZAM MOHAMMAD ALI JINNAH نے اسلام آباد سے ۱۹۷۶ میں شائع کیا۔

جمہوریۂ اسلامیہ (ISLAMIC REPUBLIC) سے گھبرا کر اور قرآنی اصطلاح "شوریٰ" کو نظر انداز کر کے انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام کے سیاسی تجربات اور روایات جمہوریہ کے خلاف رہے ہیں اور اس لیے یہ نام تضاد بالالفاظ (CONTRADICTION IN TERMS) ہے۔ لہٰذا ہم سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسی ریاست جس کی بنیاد اسلامی عقائد اور قانون پر ہو کس حد تک ری پبلک (REPUBLIC) کے اس مفہوم سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے جو عام طور پر اس اصطلاح کا لیا جاتا ہے؟ ان جیسے خیالات اور تصورات کے مفصل اور مستند جوابات، تجزیاتی اور فنی ضروریات کو سامنے رکھ کر تو پاکستانی مورخین ہی دیں گے اور ان کا یہ ایک نہایت اہم فریضہ ہے، مگر اصولی طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فنی اصطلاح کسی علم یا عمل کے بنیادی تصور اور اس سے متعلق امور کی نوعیت اور وسعت کی بنیاد پر معرض وجود میں لائی جاتی ہے اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی اصطلاح کے مفہوم اور پابندیوں کی حدود میں رہنے کی خاطر بنیادی تصورات اور ان کو عملی شکل دینے کے طریقہ ہائے کار کی نوعیت اور حدود میں تبدیلی کی جائے۔ اگر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہمارے بنیادی تصورات کو عملی لباس پہنانے کی کوشش میں کوئی اصطلاح رکاوٹ ثابت ہوگی تو یقیناً اس کو رد کر دیا جائے گا، لیکن راہ راست سے ایک انچ بھی انحراف نہیں کیا جائے گا۔

ایک اور اہم مسئلہ جس سے ہم کو نظریۂ پاکستان کی تاریخ کے مطالعے اور اس کے تجزیے کے سلسلے میں اصطلاحوں کے مفہوم سے دوچار ہونا پڑتا ہے، قومیت کا تصور ہے جس کی طرف شاعر مشرق نے ان اشعار میں نہایت صحیح اور مفکرانہ انداز میں اشارہ کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(بانگ درا)

مجھے امید ہے کہ میری ان گذارشات پر پاکستانی مورخین، محققین توجہ دیں گے اور اپنی تحقیق کے نتائج سے کتابوں اور مقالوں نیز اپنے لیکچرز کے ذریعے نوجوان نسل کو مستفیض ہونے کے مواقع فراہم کریں گے۔ یہ ہمارا قومی فریضہ ہے، صرف مورخین اور مصنفین ہی کا نہیں بلکہ ہر بالغ نظر اور محب الوطن پاکستانی کا جو ادب، ثقافت، صحافت، ذرائع ابلاغ یا زندگی کے ایسے دوسرے مشاغل سے متعلق ہے جن کے ذریعے سے نوجوان نسل کی تربیت کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

پاکستانی ثقافت

میرا موضوع گفتگو "پاکستانی ثقافت" ہے۔ موضوع کی اہمیت کے متعلق کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ثقافت کی مختلف تعریفوں اور وضاحتوں کو پیشِ نظر رکھ کر جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ثقافت میں وہ تمام اقدار، افکار، افعال اور عادات شامل ہیں جنھیں کسی معاشرے، سماج یا سوسائٹی کے افراد عزیز رکھتے ہیں، برتتے ہیں یا برتنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس معاشرے کے افراد بچپن ہی سے ایسے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں کہ ان کے اعمال بلا کسی ارادے کے انجام پانے لگتے ہیں۔ ان غیر مرئی سانچوں کی مطابقت تحسین و جزا کے ثمرات کا ذریعہ بنتی ہے اور ان سے دوری تنقید و سزا کی مستوجب۔ کسی معاشرے کا فرد اپنے مسلسل تجربے اور مشاہدے سے یہ بات سیکھ لیتا ہے کہ دوسرے افراد اس سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ اسی کے مطابق وہ دوسروں سے توقعات وابستہ کرتا ہے۔

ثقافت ایک غیر شعوری پابندی ہے لیکن یہ پابندی زندگی میں سہولت پیدا کرتی ہے۔ غیر شعوری اس معنی میں کہ جس طرح ہم ہوا میں سانس لیتے ہیں، لیکن اکثر ہوا کے وجود سے غافل رہتے ہیں اسی طرح ہم ایک مخصوص ثقافت میں سانس لیتے ہیں لیکن عموماً اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہوا کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب وہ تیز ہو، سرد یا گرم ہو یا کسی چیز سے آلودہ ہو۔ اسی طرح ہمیں ثقافت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اس میں غیر معمولی رنگ آجائے۔ جب ایک معاشرے کے افراد دوسرے معاشرے کے افراد سے ملتے ہیں تو مختلف ثقافتوں کا امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ ثقافتوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اقدار میں فرق ہوتا ہے۔ خیر و شر، خوب و ناخوب کا تصوّر مختلف ہوتا ہے۔ ان اقدار اور تصورات کے نتیجے میں تمدّن اور معاشرت اور ان کے مظاہر میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے، اوڑھنے، ملنے جلنے کے طریقے اور وسیلے مجموعی طور پر تمدن کہلاتے ہیں اور تمدن ثقافت سے متاثر اور متشکّل ہوتا ہے۔ ایک ہی ثقافت کے تحت تمدنی مظاہر مختلف

ہو سکتے ہیں۔ ان تمدنوں میں مقامی آب و رنگ کا اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن تصورات اور اقدار کی یکسانیت تمدنی اختلاف کے باوجود ان کو باہم قریب رکھتی ہے۔

پاکستانی ثقافت بنیادی طور پر اسلامی ثقافت ہے اور اس کے فکری اجزا اسلامی اقدار سے ہم آہنگ ہیں۔ اس کی ایک رنگی میں رنگا رنگی مقامی آب و ہوا، زمین، رسم و رواج، زبان، لباس، روایات و حکایات سے پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح پاکستان کے مختلف علاقوں میں معمولی اور جزوی اختلاف کے باوجود اسلامی ثقافت کی روح کارفرما ہے اور رہنی چاہیے۔ یہی مختلف علاقوں کی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ذریعہ ہے اور اسی سے ہمارا قومی وجود اپنا جواز پیدا کرتا ہے۔

پاکستان کے فن تعمیر کو ہم پاکستانی اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی ہے اور مغلوں نے ان علاقوں پر تعمیر و عمارات کے اہم لافانی نقوش چھوڑے ہیں جو آج پاکستان میں شامل ہیں۔ اگر ہم اس حقیقت سے صرف نظر کرلیں اور پاکستان میں اس کے قیام کے بعد کے فنِ تعمیر پر غور کریں تو کم از کم مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جو مسلمانوں کے تہذیب و تمدن اور ان کی ثقافت سے ہم آہنگ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جس ملک کے بارے میں ہنوز یہی فیصلہ نہ ہوا ہو کہ اس کا تشخص کیا ہے، اور اس کے بغیر اس کا نظام تعلیم و تعلم ہنوز غیر نظریاتی بلکہ نظریۂ حیات ملّی سے متصادم ہو وہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی ثقافت کا مظاہرہ کر بھی کیسے سکتا ہے۔

فن تعمیر بلاشبہ تشخص و امتیازات کا حامل ہوتا ہے اور یہ اقوام و ملل کے تہذیبی اور فکری اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے، مگر قیام پاکستان کے بعد ہم مسلمانوں نے تعمیرات کے فن میں اپنے تشخص کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

میری رائے میں یہ سب سے سنگین مسئلہ ہے جو ملّی حیثیت سے بڑی توجہ کا محتاج ہے۔ وفاقی وزارت ثقافت کے ایک بزرگ کا اصرار تھا کہ موئن جو دڑو پاکستانی ثقافت کا مظہر ہے۔ ایسی رائے صرف ان حالات میں قائم کی جاسکتی ہے کہ جب ہم نے اپنی ثقافت کا فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔ ہماری وزارت ثقافتی امور تو ابھی تک اسلامی ثقافت اور پاکستانی ثقافت کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہے بلکہ وہ اس پر مصر ہے کہ اسلامی ثقافت سے صرف نظر کرکے پاکستانی ثقافت کی بات کرنی چاہیے۔ جس ملک میں فکر و نظر کا یہ بحران ہو وہاں فن تعمیر میں تشخص کے امتیازات قائم کرنا آسان نہیں ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ممکن نہیں ہے۔

ثقافتی امتیاز

ثقافت کا مسئلہ ہمیشہ سے اہل علم اور اصحاب فکر کی توجہ کا محور رہا ہے۔ خصوصاً پاکستان بننے کے بعد پاکستانی ثقافت کے تعین، تلاش اور تعریف پر پرجوش بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ ثقافت کا مسئلہ زندگی اور موت کے مسئلے کی طرح ہوتا ہے، اس لیے جوش فطری تو ہے، لیکن کافی نہیں ہے۔ جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ثقافت، تہذیب اور تمدن کے الفاظ اور ان کے مفاہیم اور ان کے حدود اہل علم میں اختلاف رائے کا باعث رہے ہیں۔ انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے اثر سے ایک لفظ 'کلچر' بھی ہمارے ہاں رائج ہوگیا ہے اور اس حد تک کہ اردو کا لفظ بن گیا ہے۔ کلچر کو تہذیب و ثقافت کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور تمدن کو سویلائزیشن کے معنی میں، جس کو عربی میں حضارت بھی کہتے ہیں۔ تہذیب اور ثقافت کو وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور تمدن کو ذرا محدود و متعین مفہوم میں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کے نتیجے میں رہن سہن، بول چال، کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں جو اثرات نمایاں ہوتے ہیں وہ تمدن سے عبارت ہیں۔ تہذیب میں علوم و فنون، افکار و تصورات، رسوم و رواج اور آداب و اطوار کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر اور افکار کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ثقافت کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں جاری و ساری اس روح کو کہتے ہیں جو اس کے تمام اعمال پر حکمراں ہوتی ہے۔ یوں اس میں معاشرت، ادب، زبان، فنون لطیفہ، تقریبات، تفریحات، رسوم و رواج، سبھی کچھ شامل ہو جاتا ہے، لیکن میں پھر بھی ان چیزوں کو ثقافت کے اجزائے ترکیبی نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یوں کہا جائے تو صحیح تر ہوگا کہ ان سب میں قوم کا نظریۂ حیات کارفرما ہوتا ہے اور اس نظریے کے زیر اثر جو نقوش ابھرتے ہیں وہی اس قوم کی ثقافت ہوتی ہے۔ اسلامی ثقافت بھی مسلمانوں کے نظریۂ حیات، ان کے عقائد اور زندگی کے بارے میں ان کے تصورات، ان کے نیک و بد کے معیارات اور انسان

اور انسان کے باہمی رشتوں اور فرد اور جماعت کے تعلق کے بارے میں ان کے نظریات پر مبنی ہے۔
قرآن حکیم نے اگرچہ تہذیب و ثقافت قسم کے الفاظ سے بحث نہیں کی ہے۔ لیکن قرآن میں ان تمام بنیادی سوالات اور اساسی عناصر کے بارے میں رہنمائی موجود ہے جو آج کی زبان میں تہذیب سے عبارت ہیں۔ قرآن حکیم زندگی اور انسان کے بارے میں جو ہدایات دیتا ہے اس کی روشنی میں اسلامی تہذیب پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

پاکستان کے حوالے سے تہذیب کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے بلکہ ہم نے پاکستان اس دعوے کے ساتھ ہی بنایا تھا کہ ہم اپنی تہذیب کی بقا اور حفاظت چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنیادی عقائد کے اتحاد کے باوجود تہذیب، مقامی رنگوں سے بھی آمیز ہوتی ہے اور ہر قوم کی تاریخ، زبان اور رسوم و عقائد بھی کسی بڑی تہذیب میں حصے دار ہوتے ہیں، جغرافیائی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک تہذیبی مزاج برقرار رہتا ہے۔ تمام اسلامی ممالک کی تہذیب ایک ہے، یعنی اسلامی تہذیب، لیکن اسی کے ساتھ ہم مختلف اسلامی ملکوں کی بہت سی چیزوں میں اختلاف اور تنوع بھی دیکھتے ہیں۔ ملت پاکستانی کا اپنا ایک انداز ہے۔ اپنے رسوم و رواج ہیں، اپنی زبانیں ہیں، اپنا لباس ہے، اپنے کھانے ہیں، اپنے برتن ہیں، لیکن ان سب میں جو روح کارفرما ہے وہ اسلامی تہذیب کی روح ہے اور اس روح میں کوئی آمیزش ہمیں گوارا نہیں۔ اسلامی ثقافت کے مزاج میں تبدیلی کی کوشش مغائرت کے مترادف ہوگی۔

اسلامی دور میں رصد گاہیں

"اسلامی دور میں رصد گاہیں" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی مذاکرہ ۱۹ تا ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو استنبول (ترکی) میں منعقد ہوا تھا۔ اس مذاکرے میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے میں نے جو مقالہ پیش کیا تھا وہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ گیارھویں صدی سے چودھویں صدی تک کے زمانے میں وسطی ایشیائی ترک برصغیر میں اپنے ساتھ جنگ کی نئی تکنیکیں مثلاً رکاب، نعل، گھوڑے کی زین اور خاص قسم کی کمانیں تو لائے مگر نظری علوم پر توجہ نہیں کی۔ زراعت کے میدان میں وہ رہٹ لائے جس نے اس علاقے میں، جو اب پاکستان میں وسطی اور جنوبی پنجاب پر مشتمل ہے، شہری پھیلاؤ اور آب پاشی کے طرز کو بدل کر رکھ دیا۔

دوسری طرف علم ہیئت اور ریاضی میں ان کا حصّہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف آئینِ اکبری میں فلکیات کے وزن مخصوص پر ابوالفضل کی تفصیل موجود ہے، لیکن یہ تفصیل بھی البیرونی کے نکالے ہوئے اعداد پر مبنی ہے اور یہ پانچ سو برس بعد لکھی گئی۔ اگرچہ ہندوؤں کے قدیم علم ہیئت کو سیاروں اور ستاروں کا فرق معلوم تھا، لیکن اس میں یونانیوں کے متوازی ترقی نظر نہیں آتی۔

یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ مغلوں نے علم ہیئت پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کی۔ حال آں کہ بابر اور ہمایوں وسطی ایشیائی ترک ہونے کی وجہ سے علم ہیئت میں الغ بیگ (۱۳۹۳ - ۱۴۴۹ء) کی خدمات سے آگاہ تھے۔ بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے:

> "کشک پہاڑی پر ایک اور بلند عمارت، رصد گاہ ہے جو فلکی جداول تیار کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی تین منزلیں ہیں۔ الغ بیگ مرزا نے اس رصد گاہ میں زیجِ گورگانی تیار کی تھی۔ گورگانی جداول آج بھی رائج ہیں، ان کے علاوہ شاید ہی کوئی اور چیز استعمال میں ہو۔ اس سے قبل ایل خانی جداول مستعمل

تھیں۔ یہ جداول وہ ہیں جو ہلاکو کے عہد میں خواجہ نصیر نے مراغہ میں رصدگاہ کی تعمیر کے بعد تیار کی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے دنیا میں سات یا آٹھ رصدگاہوں سے زیادہ تعمیر نہیں ہوئیں۔" (صفحات ۸۰ - ۸۱)

بابر کو اپنی سلطنت مستحکم کرنے کا وقت نہیں مل سکا۔ وہ اعلا پایے کا تیز نظر مبصّر تھا اور ہر چیز کا انتہائی ذکاوت سے مشاہدہ کرتا تھا۔ یہ ذکاوت اس کے پوتے جہاں گیر کے حصّے میں آئی، لیکن وہ عامل کم اور جمال پسند زیادہ تھا۔ وہ چاہتا تو رتھ کا ساز، شیشے کی صنعت اور مغربی میکانکی اختراعات شروع کرا سکتا تھا، لیکن اُس نے صرف بلّور کی تعریف اور برطانوی سفیر دربار سر طامس رو کی پیش کردہ گھوڑا گاڑی کو قبول کرنے پر اکتفا کیا۔

جہاں گیر نے بستانیت (باغ بانی) کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ جیسا کہ آگرہ میں انناس کاشت کرانے کے بیش قیمت منصوبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ امرود، مکئی اور تمباکو نئی دنیا سے درآمد کیے جاتے تھے، لیکن صنعتیات (ٹکنالوجی) کے میدان میں کوئی قابل ذکر کام نظر نہیں آتا۔ یہ تلخ سبق اس وقت حاصل ہوا جب عہد اورنگ زیب کے اواخر میں سب سے بڑے مغل جہاز گنج سوائی کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور بادشاہ یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ مغل زمین پر اور اہل مغرب سمندر پر حکومت کرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ہیئت کا ستارہ زوال میں آ چکا تھا، اس لیے صرف تنہا مغل ہی موردِ الزام نہیں ٹھیرائے جا سکتے۔ ایران کے شاہ اسماعیل (۱۵۰۲ - ۱۵۲۴ء) نے نصیرالدین طوسی کی رصدگاہ کو بحال کرنے اور اس کی مرمت کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے یہ کام امیر غیاث الدین منصور ابن امیر صدرالدین محمد الشیرازی (وفات ۱۵۴۲/۱۵۴۳ء) کو تفویض کیا، لیکن شاہ کے سامنے اس کے التوا کے لیے ایک عجیب و غریب وجہ پیش کی گئی۔ وہ یہ کہ تعمیر کے کام کو زحل کی دَوری گردش کی مطابقت میں تیس برس کی مدّت پر پھیلانا پڑے گا۔ چناں چہ منصوبہ ہمیشہ کے لیے بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ - ۱۵۷۶ء) کا اصفہان میں رصدگاہ قائم کرنے کا منصوبہ بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اٹھارھویں صدی میں جے پور کے مہاراجہ سوائی جے سنگھ (۱۶۸۶ - ۱۷۴۳ء) نے بادشاہ محمد شاہ کے لیے ۱۷۲۸ء سے ۱۷۳۴ء کے دوران پانچ رصدگاہیں جے پور، دہلی، بنارس، اجین اور متھرا میں تعمیر کرائیں۔ سب سے پہلے دہلی کی رصدگاہ تعمیر ہوئی۔ جے سنگھ نے یہاں سات برس تک مشاہدات جاری رکھے اور پھر ستاروں کی زیج تیار کی جو الغ بیگ کے مطابق تھی۔ لابار بی نیس

(LA BARBINAIS) نے بنارس کی ایک رصدگاہ کی تفصیل بیان کی ہے جو اس نے خود اٹھارھویں صدی میں قائم کی تھی۔

ایدن سایلی اپنی کتاب "اسلام میں رصدگاہ" میں یوں رقم طراز ہے :

"پندرھویں صدی کے ایک مصنف عبدالرشید ابن صالح ابن نوری الیاقوتی (یا باقی) نے شہر جیلی کی ایک رصدگاہ کا ذکر کیا ہے۔ ہندستان کا یہ آزاد شہر اچھی طرح فصیل بند ہے اور ساحل سمندر پر واقع ہے۔ وہاں دار چینی کے درخت بھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ وہاں کے باشندے ستارۂ قلب الاسد (REGULUS) کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ چھوٹی سی رصدگاہ تھی یا کوئی فلکیاتی مندر"۔

توضیح الادراک جو بہاء الدین آملی کی تصریح الافلاک کی شرح ہے، کے صفحہ ۶۳ پر عبداللہ شکری ابن عبدالکریم القنوی رقم طراز ہے۔

"ہندی فلسفہ دانوں نے طول البلد کی اصل اپنے شہر الکنکدوز یا الذرکنک کے خط نصف النہار سے شمار کی اور انھوں نے وہیں مشرقی جانب ایک رصدگاہ بنائی"۔

جی۔ آر۔ کے (G.R.KAYE) اپنی کتاب جے سنگھ کے فلکی مشاہدات (THE ASTRONOMICAL OBSERVATIONS OF JAI SINGH) میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جے سنگھ کے عہد سے پہلے صحیح معنیٰ میں کوئی رصدگاہ تعمیر نہیں ہوئی۔

برصغیر میں علم ہیئت کے بارے میں سایلی کی قطعی رائے یہ ہے :

"یہ بات قابل غور ہے کہ جے سنگھ کی رصدگاہوں کی بنیاد پیرس کی رصدگاہ کے ستر برس بعد ڈالی گئی۔ چوں کہ یہ رصدگاہیں بعد کی ہیں اس لیے وہ نہ تو تاریخ میں کوئی اہم مقام پا سکتی ہیں اور نہ وہ بالخصوص اسلام میں رصدگاہ کی ارتقا میں دل چسپی کی حامل ہیں۔ اگرچہ ہندی فلکیات کا اسلام پر اچھا خاصا اثر مرتب ہوا تاہم جہاں تک متعلقہ رصدگاہوں کی ابتدا اور ارتقا کا تعلق ہے اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اسلام ہندی اثر سے مستفید ہوا ہو"۔ (اسلام میں رصدگاہ - ۳۶۱)

علم ہئیت کی اس طبقہ وار تفصیل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رصدگاہ کے بغیر علم ہئیت کی ترقی کی بات کیسے سوچی جا سکتی ہے؟

حیدرآباد (دکن) میں ۱۹۰۸ء میں نظامیہ رصدگاہ کی تعمیر ایک امتیازی نشان کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں حیدرآباد کے بارے میں کچھ کہنا بے جا نہ ہوگا کیوں کہ وہ مسلمان ریاستوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ حیدرآباد جنوبی ہندستان کا ایک شہر ہے اور یہ ہندستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست کا نام بھی تھا جس کا دارالحکومت حیدرآباد تھا۔ مختصراً ہندستان برطانوی ہند اور دیسی ہند میں تقسیم تھا۔ اول الذکر پر برطانوی حکومت کی براہ راست حکم رانی تھی۔ جب کہ دیسی ہند چھوٹی بڑی بہت سی ریاستوں پر مشتمل تھا جن میں ہر ایک کا حکم راں کوئی راجہ یا نواب تھا۔ یہ تمام مقامی حکم راں برطانوی حکومت کے ماتحت تھے لیکن اپنے اندرونی معاملات میں انھیں مختلف درجوں کی آزادیاں حاصل تھیں۔ حیدرآباد مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست تھی، اس کے حکم راں کو نظام کہا جاتا تھا اور اسے یہ بے مثل امتیاز بھی حاصل تھا کہ نظام کو ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس کہا جاتا تھا جب کہ دوسرے تمام حکم راں صرف ہز ہائی نس کہلاتے تھے۔ یہ ریاست نظام الملک نے اٹھارویں صدی میں قائم کی تھی جو اس کے جانشینوں کی حکم رانی میں مسلسل ترقی کرتی رہی۔ اس کے آخری حکم راں کا نام میر عثمان علی خاں تھا۔ تقسیم ہند کے موقع پر جب ہندستان اور پاکستان کی آزاد مملکتیں قائم ہوئیں تو حیدرآباد نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا، لیکن پھر ۱۹۴۸ء میں اسے ہندستان میں ضم کر لیا گیا۔

حیدرآباد کے حکم راں علم اور سائنس کے بڑے مربی گزرے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا جال پوری ریاست میں بچھا ہوا تھا۔ اردو زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ دوسری زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا بھاری کام انھوں نے اپنے ذمے لیا۔ پیشہ ورانہ تربیت اور اعلا سطح تک تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی یونی ورسٹی کو جامعہ عثمانیہ کہتے تھے۔ حیدرآباد اب بھی ایک اہم ثقافتی مرکز ہے۔ جہاں مسلمانوں کے میل جول میں اردو مشترک زبان ہے۔

حیدرآباد میں علم وادب، سائنس اور صنعتیات میں جو ترقی ہوئی وہ بے مثال ہے۔ وہیں ایک رصدگاہ بھی قائم کی گئی تھی۔

حیدرآباد کی رصدگاہ نواب ظفر جنگ بہادر کی طرف سے دو دُور بینوں کے عطیہ ملنے پر قائم کی گئی تھی۔ جب بالآخر ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہوئی تو اُس کے ایک سال بعد رصدگاہ کا انتظام بھی اس نے سنبھال لیا۔ اس کی ایک خاص بات اس کا ستارہ نگار (ASTR-OGRAPH) تھا جس کا نیم کروی گنبد ۲۵ فیٹ کا تھا۔ اسے کک اینڈ سنز، یارک، برطانیہ نے

بنایا تھا۔ رصدگاہ کے پہلے ڈائرکٹر اے بی چیٹ وڈ (A. B. CHATWOOD) کی نگرانی میں اسے دومنزلہ عمارت میں نصب کیا گیا۔

اس رصدگاہ کے ابتدائی ساز و سامان میں ایک آٹھ انچ کا ضیابصری ستارہ نگار (PHO-TOVISUAL ASTROGRAPH) اور پندرہ انچ کی بصری گرب انعطافی دوربین (VISUAL GRUB REFRACTOR) شامل تھی بعد میں ایک آلۂ عبور (TRANSIT INSTRUMENT)، دو ملنے شا زلزلہ نگار (MILNE-SHAW SEISMOGRAPH)، ایک بلنک تقابل نما (BLINK COMPARATOR) اور ایک ہیل طیفی شمس بین (HALE SPECTRO-HELI-OSCOPE) کا اضافہ کیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں ایک بڑی دوربین کے اضافے سے جو جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے بڑی دوربین تھی، اُسے ترقی دینے کا منصوبہ شروع ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں ایک ۴۸ انچ کی دوربین نصب کر دی گئی۔ حلوان، مصر (۳۱ مشرق، ۳۰ شمال) اور اوکیاما، جاپان (۱۳۴ مشرق ۳۴ شمال) کے درمیان میں یہ سب سے بڑی دوربین ہے۔ نظامیہ رصدگاہ دوسری رصدگاہوں کی بھی پیش رو ثابت ہوئی ہے۔ ان میں کوڈے کینال اور نینی تال کی رصدگاہوں میں چالیس چالیس انچ کی انعطافی دوربینیں (REFRACTORS) ہیں اور ٹاٹا بنیادی ریسرچ کے انسٹی ٹیوٹ میں ریڈیو دوربین ہے۔ نظامیہ رصدگاہ کی دوربین کے لیے ایک نئی عمارت رنگا پور میں تعمیر کی گئی ہے۔

نظامیہ رصدگاہ بہ شمول کوڈے کینال رصدگاہ کے برصغیر میں انعطافی دوربین والی پہلی رصدگاہ ہے۔ یہ اعزاز جامعہ عثمانیہ کو حاصل ہے کہ برطانوی ہند میں سب سے پہلی رصدگاہ اسی کے پاس تھی۔ یہاں تک کہ یہ اعزاز اس سے قدیم تر کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونی ورسٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوا۔

نظامیہ رصدگاہ کی دوربین کی ایک نادر بات یہ ہے کہ اس کا بیکر کوریکٹر سسٹم (BAKER CORRECTOR SYSTEM) ہے جو اسے ایک بڑے ستارہ نگار میں تبدیل کر دیتا ہے جس کا غایت درجہ صحیح حلقۂ نظر ۸ء۳ ہے۔ اس کی وجہ سے یہ دنیا کے بیکر کوریکٹر سسٹموں میں سے سب سے بڑی دوربین ہے اور وسیع عکسی قابلیت کے لحاظ سے بھی یہ دنیا کی تین بڑی دوربینوں میں سے ایک ہے۔ جب کہ ماؤنٹ پلومر، کیلی فورنیا (امریکا) (MT. PALOMAR, CALIF.) کی ۴۸ انچ شمٹ دوربین (SCHMIDT TELESCOPE) اور مشرقی جرمنی میں توتن برگ

(TAUTENBERG) کی ۱۵۴ انچ شمٹ دوربین کا حلقۂ نظر ۶،۴۵ ہے۔
اس مرکز نے جس پروگرام کا خاکہ بنایا ہے اور اسے ہاتھ میں لیا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دو ستاروں مریخ اور زہرہ کے چند طیف بینی (SPECTROSCOPIC) اور تداخل پیمائی (INTERFEROMETRIC) مطالعے، چاند پر چیدہ قطعات کے عکسی (PHOTO-GRAPHIC) اور تقطیب پیمائی (POLARIMETRIC) مطالعے، بعض کروی جھمکوں اور کہکشانی جھمکوں (GALACTIC CLUSTERS) کے عکسی اور ضیا برقی (PHOTO ELECTRIC) مطالعے، بعض قریبی ثنائی ستاروں (BINARIES) کے ہمہ وقت طیف بینی اور ضیا برقی مطالعے، بعض ہلکی روشنی والے فلکی ماخذوں کا مطالعہ اور خاص کر زمین کی بیرونی فضا اور زہرہ کی تاریک سطح سے بعض برقیاتی اخراجات کا مطالعہ، بعض دیگر قسم کے ستاروں کی نظر سمتی رفتار کی پیمائش، بعض بی۔ اے ایف ستاروں کی مطلق توانائیوں (ABSOLUTE ENERGIES) کی پیمائش، بعض ڈیلٹا، سکوٹی اور بیٹا، کلب اکبر کے ستاروں (DELTA, SCUTI AND BETA-CANIS MAJORIS) کی روشنی اور طیف کے انحراف مدار (LIGHT AND SPECTRUM VARIATIONS) نظام ہائے ثنائی (BINARY SYSTEMS) اور سیارگان نظام ہائے ثنائی اور مخصوص طیفوں (SPEC-TRA) والے ستاروں کے مخلوط طیفوں کی جماعت بندی عیار کا مطالعہ، ادنا ستاروں کی ضیا پیمائی اور وضعی پیمائش (PHOTOMETRIC AND POSITIONAL MEASUREMENT)۔

اس مرکز کا ایک بڑا مطالعاتی پروگرام کہکشاؤں کی حرکیات کی نظری تحقیق کے ضمن میں ہے اور اس میں کہکشاؤں کے قریبی تصادموں میں تجاذبی توانائی (GRAVITATIONAL ENERGY) کا تبادلہ اور کہکشاؤں کے جھمکوں میں آرام کے وقت کا تعین شامل ہے۔

ایک اور پروگرام جو عصری موضوع سے زیادہ متعلق ہے حال میں دریافت ہونے والے ستارے کوسارس (QUASARS) کی بصری پہچان اور طیفی ضیا پیمائی کے مطالعے کے لیے بیکر۔ کورنیکٹر سسٹم کے غایت درجہ صحیح اور وسیع حلقۂ نظر کا استعمال اور دوسرے طیف بینی اور ضیا برقی سامان کا استعمال ہے۔

مطبوعہ فلکیاتی مواد میں مرکز رصدگاہ کی ایک جامع خدمت اس کے ستارہ نگار زیچ کے سلسلے ہیں۔ ۱۹۰۹۔ ۱۹۴۶ء میں رصدگاہ نے عالمی پروگرام کارت دوسیل (CART DU CIEL) میں شرکت کی۔ اس پروگرام کا مقصد ہم رتبہ ستاروں کی صحیح پیمائش کر کے ایک

جامع ستارہ نگار زیج کی تیاری تھا۔ تقریباً آٹھ لاکھ ستاروں کے مشاہدات پر مبنی بارہ زیج شائع کی جا چکی ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے بعد یہ پروگرام ترک کر دیا گیا کیوں کہ عکسی پلیٹیں دست یاب نہیں تھیں۔

حقیقت میں ۱۹۰۹ء ہی میں نظامیہ رصد گاہ کو ستارہ نگار چارٹوں کے ۱۷ تا ۲۵ درجے تک کے علاقوں کی عکسی تصویریں اتارنے اور پیمائش کا کام تفویض کر دیا گیا تھا۔ یہ کام ابتدائی طور پر سانتیاگو رصد گاہ کے سپرد تھا۔ صحیح طور پر اس پر کام ۱۹۱۰ء میں چیبٹ وڈ کے جانشین آر۔ جے۔ پوکک نے شروع کیا۔

رصد گاہ کے ایجادی کاموں میں یہ چیزیں شامل ہیں (۱) وائی وائی سی ایم کے ضیاپیمائی مشاہدات (۲) ۶۳ جی اور کے قسم کے ستاروں کی نظرسمتی رفتاریں (RADIAL VELOCI-TIES) اے۔ ڈی۔ ابھینکر ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۴ء) (۳) ۶۹ جی، کے اور ایم قسم کے ستاروں کی نظر سمتی رفتاریں (ایم۔ بی۔ کے شرما، ۱۹۶۷ء)

۱۹۶۸ء تک رصد گاہ کے کارکنوں کے ۱۲۷ ایجادی مقالے ہندستان کے اندر اور باہر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بیش تر مقالے فلکی طبیعات میں چوٹی کے جرائد الیسٹروفزیکل جرنل اور ریٹ شریفیٹ فرالیسٹرو فزیک میں شائع ہوئے۔

اس مرکز کے ماضی کے پس منظر اور اس کے فائدین کی بے مثال خدمت کے جذبے کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ہیئت کی کوئی تاریخ بھی اس وقت تک جامع نہیں ہو سکتی جب تک اس میں علم ہیئت کی اعلا تعلیم کے مرکز حیدرآباد (دکن) کا ذکر نہ ہو۔

پاکستان میں فارسی کا مستقبل

اگر غور کیا جائے تو مسلمانانِ برصغیر کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں، مذہب کے بعد، تسلسل کا سب سے اہم عنصر فارسی زبان ہے۔ شعر و ادب، مذہبی کتب، تاریخ، فنِ تعمیر کی اصطلاحیں اور بیشتر فنونِ لطیفہ کی اصطلاحوں کا ماخذ فارسی زبان ہے۔ اگر برصغیر میں فارسی ایرانیوں کی شمشیر زنی کے نتیجے میں آتی تو ہو سکتا تھا کہ آج کل کی سیاسی زبان میں اسے ایرانی سامراج کا شاخسانہ کہا جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سرزمین میں فارسی اہلِ ایران نہیں لائے بلکہ ترک لائے تھے! وہ ترک جو خود فاتح تھے لیکن زلفِ فارسی کے اسیر تھے۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبان میں یہی فارسی کا قوی عنصر تھا جس سے تعلق کے نتیجے میں اردو نے جنم لیا۔

پچھلے ایک ہزار سال کی تاریخ میں فارسی زبان مسلمانوں کی تہذیب کو ایک ست رنگی قندیل کی طرح منوّر کرتی رہی۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے اس کے سب سے بڑے مظہر دو ہیں: ایک ہمارا ہزار سالہ تاریخی ادب اور دوسرے اردو شاعری۔ اردو شاعری اپنے پورے رنگا رنگ سفر میں برابر مڑ مڑ کر ان مرغزاروں کو دیکھتی رہی جن کی پرورش ایرانی سرچشموں سے ہوئی تھی۔ تشبیہات ہوں یا استعارے، تلمیحات ہوں یا دیومالا، دریا اور پہاڑوں کے نام ہوں یا چرند پرند کے، بیشتر کا منبع فارسی زبان اور ایران تھا۔

آج اردو شاعری اور اردو ادب ایک خطرناک موڑ پر کھڑے ہیں۔ اردو کے عظیم شعراء میر و غالب سے لے کر اقبال، جوش اور فیض تک سب شعر العجم کی روایات میں رچے ہوئے تھے۔ اب بیسویں صدی کی آخری دہائی میں جو نوآموز شاعر شعر و سخن کی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں، ان میں سے بہت سے فارسی سے نابلد ہیں۔ ان کا رشتہ ان سوتوں سے، جو پیرایۂ اظہار اور الفاظ کے حُسن کے احساس کی نادیدہ پرورش کرتے ہیں، قوی نہیں ہے۔ کیا کوئی شاعر، چاہے وہ اردو میں نغمہ سرا ہو یا پنجابی اور سندھی میں یا پشتو اور بلوچی میں، فارسی خزانۂ ادب سے منہ موڑ کر ایسا کلام لکھ سکتا

ہے جس میں فارسی جیسی گیرائی ، رعنائی اور بقا کا سامان ہو؟ کیا آج کے نوجوان شاعر کے پاس وہ خزانۂ الفاظ ہے جواب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے نوجوان شاعر کے پاس تھا؟ اگر نہیں ، تو پھر ہماری شاعری کا مستقبل کیا ہے ؟

یہ کہا جاسکتا ہے کہ قوم شاعری کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ جمالیاتی جہت سے محروم ہو کر بھی زندگی کے دوسرے سرچشموں سے سامان بقا حاصل کرسکتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنی تاریخ کے سوتوں سے دور جا پڑے اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ کیا ماضی کے رشتوں سے کٹ کر مستقبل کے اَن دیکھے راستوں میں اعتماد کے ساتھ قدم رکھا جاسکتا ہے ؟

مسئلہ یہ ہے کہ برِصغیر میں ہماری تاریخ کے سب نہیں تو بیشتر منابع فارسی زبان میں ہیں خصوصاً اس سرزمین میں ہمارے دورِ تفوق کی ساری داستانیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔ اب جب ہم فارسی سے نابلد ہوتے جارہے ہیں، تو کیا ہم اپنی تاریخ کو سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل رہیں گے ؟ عام لوگوں کو تو چھوڑیے ، تاریخ کے اساتذہ میں اب کتنے ہیں جو فارسی بلد ہیں ؟ جو چند پرانے اساتذہ فارسی بلد باقی ہیں تو ان کے بعد جو نوجوان اساتذہ اُن کی جگہ لیں گے ، وہ کون سی کتابیں پڑھ کر طلبہ کو پڑھائیں گے ؟ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ بھارت اور مغرب کے محققین کی تحقیق اور تالیف پر انحصار کریں۔ یاد رکھیے ، علم کبھی ٹھیرتا نہیں۔ وہ تاریخی کتابیں جو ہمارے فارسی داں اہلِ علم نے پچاس ساٹھ سال پہلے لکھی تھیں ، وہ حرفِ آخر نہیں ہیں۔ اگر ہم فارسی سے نابلد ہونے کے باعث تحقیق و تالیف کی صلاحیت کھو دیں گے تو دوسرے خالی نہیں بیٹھیں گے۔ پھر "قلم در دست دشمن است" والی بات بڑے بھیانک روپ میں سامنے آئے گی۔ اغیار ہماری تاریخ کی شکل بگاڑ دیں گے اور ہم بے بسی سے دیکھتے رہ جائیں گے۔

ابھی وقت ہے کہ اس خوفناک مستقبل کو حقیقت بننے سے روکنے کی کوئی تدبیر سوچی جائے۔

جاپانی ہائیکو

جب مجھے جاپان ثقافتی مرکز نے چھٹے ہائیکو مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تو سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے جاپانی شاعری کی اس صنف کو اردو میں کبھی کبھی پڑھا ہے اور اپنے ذوق کے مطابق اس سے محظوظ بھی ہوا ہوں، لیکن جس کو باقاعدہ یا بالاستیعاب مطالعہ کہتے ہیں اس کا موقع نہیں ملا۔ آخر میری سوچ اس نتیجے پر ختم ہوئی کہ ہائیکو کو سمجھنے کا یہ ایک اچھا موقع ہے کہ ہائیکو کو خود شعرائے کرام کی زبان سے سُنا جاتے اور ہائیکو شاعری کے ذریعے سے اپنے دوست ملک جاپان کی تہذیبی روح اور تخلیقی امنگوں کو بہتر طریقے سے سمجھا جائے۔

جاپان اور پاکستان دو برادر دوست ملک ہیں اور باہم مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ پاکستان کے لوگ جاپانی مصنوعات سے مستفید ہوتے ہیں اور ان کو اپنے انتخاب میں اولیت دیتے ہیں۔ سائنس اور خصوصاً ٹکنالوجی میں جاپان کی قابلِ رشک ترقی ہم پاکستانیوں کے لیے مسرت کا باعث اور سبق آموز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دورِ مسابقت میں جاپان برقیاتی فنیات یا الیکٹرونک ٹکنالوجی کی پیش رفت میں انتہائی ترقی یافتہ ممالک کی ہم سری کر رہا ہے۔ اس کے باوجود جاپان کے خوش ذوق لوگ اپنی شاعری کو بھی گلے سے لگائے ہوتے ہیں۔ صنعتی دوڑ کی کشاکش میں بھی جاپانی ہائیکو کے لطف سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ صدیوں پرانی یہ صنفِ سخن آج بھی جاپانیوں میں مقبول اور جاپان کا قیمتی ادبی اثاثہ ہے۔ آج جاپان میں ایسے شاعروں کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ ہے جن کی آمدنی کا واحد ذریعہ ہائیکو نویسی ہے اور اس کے باقاعدہ قارئین کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانی اخبارات باقاعدہ ہائیکو شائع کرتے ہیں اور اخبارات میں ہائیکو کالم مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بعض ادبی رسائل بھی ہائیکو کو مستقل عنوان بناتے ہیں۔ اردو شاعروں نے ہائیکو کی صنف کو اپنا کر اردو شاعری میں نئے اسالیب کی طرح ڈالی۔ بعض شعرا کے تو ہائیکو مجموعے بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ جاپان ثقافتی مرکز نے تین ہائیکو مشاعروں کے جو گل دستے شائع کیے ہیں ان سے بھی ہمارے شاعروں کی

ہائیکو میں گہری دل چسپی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہائیکو میں طبع آزمائی کرنے والوں میں پرانی اور نئی نسل دونوں کے شعرا شامل ہیں۔ جاپانی ہائیکو کے ترجمے بھی ہیں اور طبع زاد کلام بھی جو ہائیکو کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو میں فنی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ہائیکو کے فنی تقاضوں کی ممکنہ تکمیل کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب اور اردو زبان کا مزاج بھی شامل ہے۔ جاپانی اور اردو زبانوں کے بین فرق کی بنا پر شاید ہائیکو کی تقلید محض ممکن نہ ہو، لیکن دونوں قوموں میں مشرقیت قدرِ مشترک ہے اور مشرق کی حسن پرستی بھی۔ پھول حسن کا شاہ کار ہے چاہے وہ انسانی ہو یا نباتی۔ ہائیکو بھی اردو شعرا کی گل افشانی گفتار سے مستفید ہو رہی ہے اور ہوگی۔ ابھی تک میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے شعرا میں سے بیشتر ہائیکو کے جاپانی حسن سے زبان فرنگ کے واسطے سے آشنا ہو رہے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایک پردہ بہرحال حائل ہے۔ جاپانی زبان میں اس جمیل صنفِ شاعری کا راست مطالعہ کچھ اور ہی بات پیدا کر دے گا۔

تہذیبی لین دین اور تبادلِ افکار تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتا ہے۔ جو قومیں دوسری قوموں کے ذہنی، علمی، ادبی اور فنی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے دل و دماغ کے دریچوں کو وا رکھتی ہیں ان کی تخلیقی صلاحیتیں لامحدود امکانات کو چھو لیتی ہیں۔ ہم نے مغربی افکار و اصناف سے استفادے میں بخل سے کام نہیں لیا اور نقصان میں نہیں رہے۔ حکمت کو ہم عقیدۃً بھی اپنی گم شدہ میراث سمجھتے ہیں اور جہاں ملے، جس سے ملے اس کو موتی سمجھ کر چن لیتے ہیں۔ یونان کی حکمت یعنی طب اور فلسفہ دونوں کو ہم نے دونوں ہاتھوں سے سمیٹا، اپنایا، بڑھایا اور پھیلایا۔ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور فرانسیسی سے اخذ و اکتساب کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جہاں تک، کم سے کم، دینی موضوعات کا تعلق ہے اردو کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے، لیکن اس علمی لین دین میں اجتماعی مزاج کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو فکر اور جو صنف ہمارے اجتماعی مزاج کو قبول نہ ہو وہ ہمارے ادب میں جگہ نہیں پا سکتی۔ ہم نے مغربی ادب کی جن اصناف کو اختیار کیا ان میں بھی اپنے آپ کو ضرور شامل کیا۔ جو صنف یا جو ہیئت اس مزاج میں نہ ڈھل سکی وہ کچھ عرصے شور مچا کر ٹھنڈی ہو گئی۔

آج کل ہائیکو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی باہمی لین دین کی ایک کڑی ہے۔ جاپان کے لوگ پھولوں سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ان کے گھروں کی تزئین و آرائش میں پھولوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ان کے ذوقِ جمال کی آئینہ دار ہے۔ رنگوں کے امتزاج و تضاد سے حسن پیدا کرنے کا انھیں خاص سلیقہ آتا ہے۔ پھولوں کی رنگت، نزاکت اور

لطافت جاپانیوں کے احساس جمال کو ابھارتی اور نکھارتی ہے۔ ان کا یہ اجتماعی ذوق ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ہائیکو کا موضوع بھی موسم بہار کی کیف سامانیوں اور پھولوں کی شادابیوں سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے ہائیکو کو بجا طور پر جمالیاتی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ تین مصرعوں پر مشتمل ہونے کے باوجود یہ مثلث اور ثلاثی سے مختلف ہے، بلکہ یہ جاپانی شاعری کی ایک صنف سن رائی یو (SEN-RYO) سے بھی مختلف ہے جس میں مصرعوں کی تعداد تو تین ہی ہوتی ہے، لیکن اس کا مزاج ہائیکو سے بالکل مختلف ہے۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ہائیکو مشاعرے پاکستان میں اس صنف کی مقبولیت کا بڑا ذریعہ بنے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ نقادوں کو بھی اس کے مطالعے کی جانب توجہ ہوگی۔ اس طرح جاپان اور پاکستان کے تہذیبی روابط میں خوب صورت اضافہ ہوگا۔

آپ کو یقیناً اتفاق ہوگا کہ دو دوست ملکوں کے عوام کو قریب سے قریب تر لانے کے لیے صرف تجارتی، صنعتی یا سیاسی تعلقات کافی نہیں ہوتے۔ ثقافتی ہم آہنگی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ دلوں کو جوڑنے اور ذہنوں کو ملانے کے لیے شعر و ادب، فنون، روایات اور تہذیب زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مجھے جاپان جانے کا اور وہاں کے شائستہ اور شگفتہ لوگوں سے ملنے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ان کی اعلا اخلاقی صفات، محنت کی عادت، کام کی دھن، ترقی کی لگن، مہمان نوازی اور خوش مزاجی سے میں بہت متاثر ہوں۔ ضرورت ہے کہ جاپانی اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے باہمی دوروں کی کوئی سبیل پیدا کی جائے، جس سے ہم ایک دوسرے کو اور زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکیں۔

اقبالیات

علّامہ اقبال کا پیغام عشق و عمل، عظمت و اخوت، خودی و خودشناسی کا پیغام ہے۔ اس پیغام پر عمل کر کے ملتِ پاکستان حیاتِ نو حاصل کر سکتی ہے۔

مطالعۂ اقبال

آج جب کہ ہم اپنی قومی زندگی کے انتہائی سخت لمحات سے گزر رہے ہیں علامہ اقبال کے پیغام کو سمجھنا اور اس سے کسبِ فیض کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مطالعۂ اقبال محض ایک علمی یا ادبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک قومی مسئلہ بھی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اقبال کے نام کی تعظیم و تکریم تو کرتے ہیں، اقبال کا شور تو بہت مچاتے ہیں، لیکن اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم اقبال سے دور ہو گئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ فکرِ اقبال سے ملت کی شیرازہ بندی کا کام لیتے، ہم افتراق و انتشار کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ نشانِ منزل ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ذوقِ سفر باقی نہیں رہا۔ جذبۂ عمل مضمحل ہو گیا۔ جوشِ اخوت سرد پڑ گیا۔ ہمارے دل سے اخلاص نکل گیا۔ حکیم الامت نے ملت کو یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت کے فاتحِ عالم ہونے کا پیغام دیا تھا۔ اس پیغام نے دلوں کو گرمایا اور قوم کو جگایا۔ جب اس بیداری کے نتیجے میں قوم کو ایک ملک مل گیا تو اس ملک کی تعمیر کے بجائے اہلِ وطن آپس میں لڑنے لگے۔ چناں چہ ایک اعلا مقصد کی فراموشی نے بہت سے چھوٹے چھوٹے اور ادنا مقاصد کو جنم دیا اور مقاصد کے تضاد سے باہم دست و گریباں ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ علامہ اقبال کی جس بانگِ درا نے ہمیں سوتے سے جگایا تھا اس کی آواز سے ہمارے کان بے بہرہ ہو گئے اور طاؤس و رباب کے نغمے ہماری توجہ کا مرکز بن گئے۔ ہم منزل سے بھٹک گئے اور قافلۂ ملت سے جدا ہو گئے۔ آفاق کو اپنے میں گم کرنے کے بجائے خود ہی آفاق میں گم ہو گئے۔ ہماری خودی خودنمائی میں گم ہو گئی۔

علامہ اقبال نے اپنے وسیع مطالعے اور بصیرت سے یہ جان لیا تھا کہ رنگ و نسل اور جغرافیائی یکسانیت کی بنیاد پر ملتِ واحدہ کا تصور مستحکم نہیں ہو سکتا بلکہ ایک مشترک عقیدہ اور کلمۂ جامعہ مختلف نسلوں اور طبقوں کو جوڑ کر شیر و شکر کر سکتا ہے۔ مسلمان ایک عقیدہ ایک مذہب اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہیں:

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ

علامہ نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مسلمانانِ برصغیر کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انھیں بے عملی، مایوسی اور انتشار و بے یقینی کی کیفیت سے نکالنے کے لیے توحید، عشقِ رسولؐ، اخوت، مساوات اور عمل کا نسخہ تجویز فرمایا۔ یہ نسخہ پہلے بھی کارگر تھا اور آج بھی کارگر ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اپنے مرض کا احساس کریں اور اس کے علاج کی ضرورت محسوس کریں۔ ہم ہر سال بڑے شوق اور ولولے کے ساتھ یوم اقبال مناتے ہیں۔ مقالات لکھتے ہیں اور دادِ تحقیق دیتے ہیں۔ علامہ کی یاد میں جلسے کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب عقیدت کے جذبے کے ساتھ اور اقبال دوستی میں کرتے ہیں، لیکن محض ان چیزوں سے اور اقبال کی یاد تازہ کر لینے سے کام نہیں چلتا۔ قوم کی قسمت اپنے اکابر اور اپنے محسنوں کو محض خراجِ عقیدت پیش کرنے ہی سے نہیں بدلا کرتی۔ قوم کی اصلاح کے لیے ان کے افکار کو اپنے افکار میں ڈھالنا، ان کے کارناموں کو عام کرنا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ علامہ نے جس محبت اور جذبے کے ساتھ درسِ خودی دیا تھا اور افکارِ مغرب کے خطرات سے آگاہ کیا تھا ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہمارے دانش وروں کو کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم علامہ کے پیغام کو عام کرسکیں تو ہمیں یقیناً ایک صحیح اور منظم معاشرے کی تعمیر میں مدد ملے گی جو آج کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

پاکستان میں جو صورتِ حال ہے یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں بلکہ اس کے کچھ اسباب و وجوہ ہیں۔ ان میں سب سے بڑی وجہ اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے متعین راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ ہمارا متعین راستہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہماری حیات خالصتہً اور کلیتہً قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ہم کتاب وسنت سے آنکھیں بند کر کے ہنگامِ زندگی میں قدم رکھیں اور راہِ مستقیم کو پالیں۔

اگر تاریخ اقوامِ عالم کا غائر مطالعہ کیا جائے تو کسی ایسی قوم کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جس نے اپنے ماضی کو بھلا دیا ہو، اپنے نظریات سے صرفِ نظر اور اپنے دستورِ حیات کو نظر انداز کر دیا ہو اور ترقی کر لی ہو۔ جن قوموں نے یہ غلطی کی انھوں نے اپنے وجود کی نفی کی اور زمانے کے تھپیڑوں نے ان کو خس و خاشاک بنا کر نابود کر دیا۔ ہمیں تاریخ اقوامِ عالم سے سبق لینا چاہیے اور اپنے حال پر غور کرنا چاہیے۔

علامہ اقبال کے افکار سے ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں مستفیض ہوسکتے ہیں۔ سیاست سے لے کر تعلیم تک ہر میدان میں اس مردِ خدا شناس اور خود آگاہ کی بصیرت ہماری رہ نمائی کرسکتی ہے۔ علامہ کا پیغام عشق و عمل کا پیغام ہے۔ عظمت و اخوت کا پیغام ہے۔ خودی اور خود شناسی کا

پیغام ہے۔ اس پیغام کو سمجھ کر اور اس پر عمل کر کے ملت پاکستان کو حیات نو حاصل ہو سکتی ہے۔

تصور پاکستان کا خالق آپ کو وہ اعلا نصب العین یاد دلاتا ہے جس کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل ہی میں ملک اور قوم کی بقا ہے۔ اس کی تکمیل ہر فرد اور ملت کا فرض ہے۔ اس مقصد کو اپنا مقصد بنائیے اور اپنی ذاتی اور قومی زندگی کی بنیاد اس پر استوار کیجیے۔ یہی وہ بہترین خراجِ عقیدت ہے جو ہم اقبال کو پیش کر سکتے ہیں اور یہی وہ راہ ہے جو ہمیں کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

افکارِ اقبال

ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اکابر رجال اور زعمائے ملّت اور رہ نمایان قوم کی یاد و احترام کی غایت و منشا کیا ہوتا ہے۔ یہ منشا و غایت قطعی طور پر یہ ہے کہ ہم ان اکابر کی عظمتوں کو سلام کریں اور ان کی رفعتوں پر غور کریں۔ عظمت و رفعت کے یہ مینار کیوں اور کس طرح بن گئے اور روشن و تابندہ ہوئے اور ان کی ضوفشانی کا سلسلہ آج تک کیسے قائم و باقی ہے؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یوم، ہفتے اور جشن ہائے صد سالہ و ہزار سالہ منائے جاتے ہیں۔ اگر ہم کسی شخصیت کے پورے تصورات اور اس کی حیات پر بھرپور حقائق کے ساتھ غور و فکر کریں اور اس کی روشنی کو پھیلانے کے سارے سامان مہیا کر دیں تو اس کی یاد اور یوم کے جشن یقیناً مفید نتائج برآمد کر سکتے ہیں اور تعمیر ملک و ملت کے لیے ان سے بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

ایسے جشن منعقد کرنے کا میرے نزدیک ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ہم عظیم شخصیات کے رشتے سے اپنے حال کو اپنے ماضی سے مربوط اور منسلک رکھ سکیں۔ یقیناً یہ بڑا اہم مقصد و منشا ہے: تاریخِ عالم اس حقیقت پر دال اور شاہد ہے کہ جن اقوام و ملل نے اپنے حال کو اپنے ماضی سے مربوط و منسلک رکھا ان کا مستقبل ہمیشہ درخشاں رہا۔ اس کے برعکس جن اقوام و ملل نے اس فطری تقاضے سے انحراف کیا، اپنے ماضی کو فراموش کیا اور اپنے ملّی ورثوں سے صرفِ نظر کیا تاریخ ان کے عروج و استحکام کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر رہی۔ ایسی قوموں کا رفعتوں کو چھونا اور بلندیوں پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

ہم ہر سال پاکستان کے طول و عرض میں بڑے اہتمام اور دھوم دھام کے ساتھ یوم اقبال مناتے ہیں۔ اس موقع پر قوم کا ہر طبقہ اقبال سے عقیدت و محبّت کا بڑے خلوص سے اظہار کرتا ہے اور پیغام اقبال کی تشریح و تفسیر کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہے۔ ادیب، دانش ور، سیاست داں، حکمراں، اساتذہ اور ماہرین تعلیم سب ہی اپنے اپنے انداز میں اقبال شناسی پر زور دیتے

ہیں اور پیغامِ اقبال کو عام کرنے کی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر طبقۂ خیال کے لوگ اور ہر مکتبِ فکر کے نمائندے فکرِ اقبال سے اپنی وابستگی کا اظہار اور عظمتِ اقبال کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔ علامہ کے افکار کی افادیت و اہمیت سے کسی کو مجال انکار نہیں ۔ ہر سال مختلف شعبہ ہائے زندگی کے سرکردہ نمائندے اس بات کا اظہار اور اعادہ کرتے ہیں کہ ہماری انفرادی زندگی اور اجتماعی نظام کی تعمیر علامہ کے افکار کے مطابق ہونی چاہیے۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔ اسی میں ہماری فلاح اور یہی ترقی و خوش حالی کا راستہ ہے۔

لیکن اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ ہر بار ہمارے قائدین کو ایک ہی بات مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں دہرانی پڑتی ہے۔ ہم ہر بار یہی سوچتے ہیں کہ ہم نے اقبال کے فرمودات پر عمل نہیں کیا اور ہم اُن کے فوائد و برکات سے مستفیض نہیں ہو سکے۔ علامہ نے سلامتی کی جو راہ ہمیں دکھائی اور فلاح کا جو راستہ تجویز کیا اس کو اپنانے کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے اور اس کے فوائد سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ پھر بھی ہم جہاں تھے وہیں ہیں۔ قومی آزادی کے پینتالیس سال گزر جانے کے باوجود بھی ہم بے راہ رو منزل ہیں بلکہ آج ہمارا شمار ان اقوام میں ہو رہا ہے جو بے مقصدیت کا شکار ہیں، حریتِ فکر سے محروم ہیں اور اپنی آزادی کے تحفظ سے عاری ہیں۔ اس صورتِ حال نے نہ صرف ہماری فکری پرواز کو محدود کر دیا بلکہ ہماری علمی صلاحیتوں کو بھی مفلوج کر دیا۔ آپ نے دیکھا کہ ہمارا نصف حصۂ جسم سے الگ ہو چکا۔ کیا ایک مکمل طریقِ علاج کی موجودگی میں یہ "مفلوجیت" حیرت ناک نہیں ہے؟ اور کیا حاذق حکیم کے ہوتے ہوئے علاج اور دفعیۂ امراض کے لیے ہمارا در بدر بھٹکتے پھرنا افسوس ناک نہیں ہے؟ یہ بڑی افسوس ناک صورتِ حال ہے کہ اقبال جیسا حکیم اور فکرِ اقبال جیسا علاج جس قوم کو میسّر ہو وہ علاج و دوا کے لیے ترسے اور محض مٹھاس کی خاطر خواب آوری کے اثرات قبول کرے۔ یہ وہی قوم کر سکتی ہے کہ جو حقائق کی کڑواہٹ کو برداشت کرنے کی صلاحیت کھو چکی ہو۔

میری رائے میں اس کے صرف دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنے دعووں میں سچے نہیں ہیں۔ یعنی ہم فکرِ اقبال کے حامی و مداح ہونے کا دعوا تو کرتے ہیں لیکن اسلام ہمارے دلوں میں نہیں رہا۔ ہم زبان سے تو کچھ اور کہتے ہیں اور دل میں کچھ اور سوچتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں قومی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں رہا اور ہم ذاتی زندگی کو اجتماعی زندگی سے الگ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقبال کے نام کی مالا جپنے کے باوجود فکرِ اقبال سے دور ہو گئے۔

علامہ اقبال کا پیغام عمل، حرکت اور حرارت کا پیغام ہے۔ آج ہم عمل سے دور اور حرکت و حرارت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ گرمیِ عمل اور سخت کوشی ہماری سب سے اہم احتیاج ہے۔ کم کوشی نے ہم کو راحت طلب بنا دیا اور بے مقصدی نے مغلوب گمان۔ ہماری قوم میں جذبۂ عمل ہے لیکن بے راہ روی نے اس کو سرد کر دیا۔ علامہ نے زیادہ تر عمل و حرکت ہی کو اپنے افکار کا محور بنایا اور اپنی چالیس سالہ فکری زندگی میں زبان شعر و نثر میں جو کچھ کہا اس کا مقصد یقین و عمل کی قوتوں کو بیدار کرنا تھا۔ افسردگی، اضمحلال اور بے عملی کو وہ فرد اور قوم دونوں کے لیے سم قاتل سمجھتے تھے۔ میں علامہ کی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں انھوں نے عمل اور محنت کی ضرورت اور فرد اور قوم کے رشتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "دیانت داری سے محنت کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ خواہ اس محنت کا اثر فرد خاص کی ذات تک محدود ہو خواہ تمام قوم پر اس کا اثر پڑتا ہو لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو فرد کا وجود قوم کے وجود کے بغیر تصور میں بھی نہیں آسکتا اور فرد کی کوئی ایسی حرکت نہیں جس کا اثر تمام قوم پر نہ پڑتا ہو اور ایسی صورت میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر فرد کی محنت حقیقت میں ایک قومی کام ہے۔ اگر اس محنت کا مدعا مذموم ہو تو قوم پر مذموم اثر پڑے گا اور نیک ہو تو اچھا اثر پڑے گا۔ پس فرد قوم کا پہلا فرض ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ اس تمدنی مقصد کو پورا کرے جو قوم نے اس کے ذمے کر رکھا ہے اور اس بات کو سمجھ جائے کہ اس کا عروج و زوال حقیقت میں قوم کا عروج و زوال ہے۔ یہی وہ محنت ہے جس کا نام عبادت رکھا گیا ہے اور جس کی نسبت فارسی شاعر کہتا ہے:
>
> جز بہ محنت نشود پا بہ رہِ عشق رواں
> اشکِ من خونِ جگر خوردہ و دیدن آموخت
>
> دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں کیوں کہ فرد کے تمام افعال و حرکات حقیقت میں قومی افعال و حرکات ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی بھی اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔ خودکشی کیوں جرم قرار دی گئی ہے؟ بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کا اقدام کرنے والے کو سزا دینا

ظلم ہے مگر یہ ایک سطحی خیال ہے۔ قانون نے اس بات کو اصولاً تسلیم کرلیا ہے
کہ فرد کی زندگی حقیقت میں قوم کی زندگی ہے اور خودکشی کرنے والا اپنی جان پر
ظلم نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں اس تمدنی قوت کو معدوم کرنا چاہتا ہے جس کا
وہ بہ حیثیت فرد قوم ہونے کے ایک مظہر ہے۔"

یہ ہیں وہ ایمان افروز الفاظ جن کے ذریعے سے مفکر ملت نے ملت کو عمل محنت اور قومی
زندگی پر اس کے اثرات کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہی اقبال کی راہ ہے جس پر چل کر ہم قومی انتشار سے
بچ سکتے ہیں۔

اقبال کا پیغام

علامہ اقبال ہمارے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور غفلت کی نیند سے جگایا۔ آزادی کا راستہ دکھایا، پاکستان کا تصور دیا اور بے عملی اور کاہلی کی دل دل سے نکلنے اور ایک بیدار اور باعمل قوم بننے کے لیے رہ نمائی کی۔ آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے جب برصغیر ہندو پاک انگریزوں کا غلام تھا، علامہ اقبال اس عالمِ وجود میں آئے تھے۔ قدرت نے ان کو ایک غلام قوم میں اسی لیے پیدا کیا تھا کہ وہ قوم کو آزادی کی اہمیت اور عظمت بتائیں اور غلامی کی ذلتوں اور نقصانات سے آگاہ کر کے اس کو آمادۂ پیکار کریں۔ علامہ اقبال نے اپنی بات شاعری کی زبان میں کی اور اپنے پیغام کے لیے نظم کا جامہ منتخب فرمایا۔ انھوں نے شاعری کو بیداری کے پیغام کا بہترین ذریعہ سمجھا۔ اگر وہ صرف نثر یا وعظ و تقریر کے ذریعے سے اپنے خیالات قوم تک پہنچاتے تو شاید اتنا اثر نہ ہوتا۔ ان کی شاعری اسی لیے سب سے الگ اور ممتاز ہے کہ اس میں ایک پیغام بھی ہے۔

علامہ اقبال نے جو پیغام دیا وہ ان تعلیمات پر مبنی ہے کہ جو آج سے ۱۴ سو سال پہلے قرآن کی شکل میں ہمارے ہادی و رہ نما حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ علامہ کا خیال یہ تھا کہ ۱۴ سو سال پہلے جو پیغام آیا تھا اس کو فراموش کر دینے سے ساری خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، لہٰذا اگر مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو قرآن کی طرف رجوع کریں۔ سچے مسلمان بنیں کیوں کہ مسلمان کی زندگی قرآن کے بغیر کوئی زندگی نہیں۔

تو اگر خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآن ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے اور ہر خرابی کی اصلاح اس کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ قرآن ہمیں زندگی گزارنے کا سیدھا سچا راستہ بتاتا ہے۔ اگر ہم اس راستے

پر چلیں تو دین اور دنیا دونوں کی بھلائی اور سعادت ہمیں حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک ہم قرآن کو اپنا دستورِ حیات سمجھتے رہے اس وقت تک ہم نہ صرف کامیاب رہے بلکہ دنیا کے قائد رہے اور سارے عالم میں ہمارا سکہ چلتا رہا۔ ہمارے اسلاف نے زندگی کے ہر میدان میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ آج بھی دنیا ان پر حیرت زدہ ہے۔ آج بھی ہم ان پر فخر کر سکتے ہیں۔ علامہ نے ہمیں اپنے اسلاف کی عظمت سے آگاہ ہونے کا سبق دیا اور بتایا کہ اگر اب بھی ہم اپنے اسلاف کا طریقہ اختیار کریں تو ہم بھی عظیم کارنامے انجام دے سکتے ہیں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلا سکتے ہیں۔ ہمارے اسلاف باعمل تھے، سخت کوش تھے، محنت شعار تھے، اس لیے ہمیں بھی سخت جدوجہد کی عادت ڈالنی چاہیے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

دنیا میں جو قومیں ترقی کرتی ہیں وہ اپنی قوتوں کو بروئے کار لا کر ہی بامِ عروج تک پہنچتی ہیں لیکن عمل اسی وقت ممکن ہے جب ہم یقین و ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں۔ یقین ہی انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے۔ ایمان ہی وہ طاقت ہے جو انسانی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ یقین سے انسان تشکیک و شبہات کی الجھنوں سے نجات پاتا ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ایمان و یقین ایک ایسی لازوال دولت ہے جو قوموں کو دوسری بہت سی دولتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور دنیا کی ہر دولت ان کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے۔ علامہ کی شاعری میں انھی حقیقتوں کو خوب صورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ان کے یقین اور خلوص کا سحر تھا کہ ان کا پیغام قوم کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا اور قوم میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ اس نے علامہ کے خواب کو ایک اور مردِ مجاہد قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔

پاکستان علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر ہے۔ علامہ کا احسان ماننے اور ان کو یاد کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم پاکستان کو ان مقاصد کے مطابق بنائیں اور ان اصولوں کو عمل میں لائیں جن کو علامہ نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اگر ہم اسلام کے اصولوں کے مطابق عمل نہیں کر سکے تو نہ ہم علامہ اقبال اور قائداعظم کے ساتھ اپنی عقیدت کا ثبوت دیں گے اور نہ ہی اپنے ساتھ کوئی بھلائی کریں گے۔

اقبال اور تعلیم

ہماری قومی اور ملّی زندگی کے متعدد المیے ہیں۔ ان میں مرکزی المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اب تک ایسا نظام تعلیم متعارف نہ ہو سکا کہ جو ہماری روایات سے ہم آہنگ بھی ہو اور ماضی و حال کے درمیان ربط و تسلسل کا مظہر بھی!

ہم اب تک فلسفۂ تعلیم پر بحث و تمحیص اور مشاہیر کے حوالوں سے تصوّرات تعلیم پر گفت گو کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب تک اپنے لیے کوئی راہ عمل متعین کرنے سے قاصر رہے۔ تعلیمی سرگرمیاں تو بہر حال جاری ہیں، مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے تعمیری نتائج سامنے نہیں آئے۔ کیوں کہ مقصدیت کا فقدان اور منزل لا معلوم ہے۔

جن مشاہیر کے تصورات تعلیم اکثر و بیشتر زیر بحث رہتے ہیں، ان میں شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال بھی ہیں۔

اقبال اور تعلیم پر کچھ لکھتے ہوئے یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ وہ بہ قول خواجہ غلام السیدین معروف معنوں میں ماہر تعلیم نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال عرصے تک صیغۂ تعلیمات سے منسلک رہے اور انھیں تعلیم و تدریس کا خاصا طویل تجربہ بھی حاصل رہا۔ وہ بلند پایہ مفکر اور آفاقی شاعر تھے اور زندگی کا جزوی نہیں بلکہ کلی شعور رکھتے تھے۔ تعمیر ملّت کی اہم بنیاد مسلمہ طور پر تعلیم ہی ہے، اس لیے وہ تعلیم کا کوئی نہ کوئی تصوّر اور نظریہ ضرور رکھتے تھے۔ اس کی جھلکیاں ان کے کلام میں بھی ملتی ہیں اور جستہ جستہ ان کے مکتوبات میں بھی، مگر کہیں واضح اور مربوط صورت میں کسی خاص نظام تعلیم پر انھوں نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ اگرچہ تعلیم کے عملی پہلوؤں کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ کی، لیکن ان کے افکار کے تجزیے سے تعلیم کا ایک تصوّر ضرور ابھرتا ہے۔ چناں چہ یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کا تصوّر تعلیم ایک تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں معاون ہو سکتا ہے۔

تصورات تعلیم کے سلسلے میں اگر سرسید اور ان کے رفقا کے تصور سے آغاز کیا جائے تو یہ کہا

جاسکتا ہے کہ علی گڑھ میں اینگلو محمڈن اورینٹل اسکول جو بعد میں یونی ورسٹی بنا، کے قیام میں سرسید کا تصور تعلیم یہ تھا کہ قوم کا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو فکر و فلسفے کے لحاظ سے تو مغربی نہ ہو لیکن علوم و فنون کے لحاظ سے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ضرور ہو۔ ایسا شاید نہ ہو سکا اس لیے ۱۲۹۳ھ میں اس تصور تعلیم کے رد عمل کے طور پر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس عمل میں آئی۔ ان دونوں کے درمیان مفاہمت کے لیے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں آیا۔ یہ تینوں ادارے جدا جدا تصور تعلیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی ایسا نظام تعلیم متعارف نہ ہو سکا جس سے دین و دنیا کی تفریق دور ہو جاتی۔

اقبال کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ دو طرز کے تعلیمی اداروں نے اسلامی معاشرے اور تمدن کو وحدت کے بجائے دوئی کے حوالے کر دیا۔ علامہ اقبال قدیم طرز کی تعلیم کے بھی حامی نہیں تھے اور جدید طرز تعلیم سے بھی مطمئن نہ تھے۔ ان دونوں طریقہ ہا ے تعلیم کی درس گاہوں کو وہ اپنی شاعرانہ زبان میں کبھی مدرسہ اور کبھی مکتب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان دونوں کو تعمیر ملت کا وسیلہ قرار دینے میں ان کو تامل تھا۔ انھیں مذہبی مدارس سے یہ شکایت تھی کہ ان کے فارغین عصری شعور سے بیگانہ رہتے ہیں۔ جدید مکتب کی تعلیم و تربیت کے نظام سے انھیں یہ گلہ تھا کہ اس سے استفادہ کرنے والوں کا ذہن قومی اور ثقافتی ورثے سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور روحانی و اخلاقی اقدار سے اس کی لاعلمی کی وجہ سے اس کا ارتقا اس انداز سے ہو رہا ہے کہ مذہب و تاریخ کے تسلسل کا رشتہ برقرار رکھنا دشوار نظر آتا ہے۔

ان کے دو تین اشعار شاید ان کے احساس و فکر کی ترجمانی کر سکیں:

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ دل برانہ

اب قدیم طرز کے مکتب کی تعلیم کے بارے میں بھی ان کا تاثر ملاحظہ کر لیجیے:

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

جدید طرز تعلیم سے بہرہ ور ہونے والوں کی ذہنی اور نفسیاتی کمزوریوں میں ایک اہم کمزوری کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں:

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

انگریزی نظام تعلیم کے بارے میں وہ صاف الفاظ میں اپنے تاثر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ان اشعار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال انیسویں اور بیسویں صدی میں رائج دونوں تعلیمی نظریات سے غیر متفق ہیں۔ قدیم طرزِ تعلیم کو جہاں وہ غیر تخلیقی تصور کرتے ہیں وہاں جدید طرزِ تعلیم کو اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کے روحانی و اخلاقی نظام کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیتے ہیں۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا تصوّرِ تعلیم کیا تھا؟ یہ بات شاید اس وقت تک واضح نہ ہوسکے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اقبال کے نزدیک علم کی تعریف کیا ہے اور وہ کس چیز کو علم سے تعبیر کرتے ہیں؟

تعلیم و تربیت کے عنوان سے ضربِ کلیم میں ان کے کچھ اشعار ملتے ہیں اور دیگر مجموعۂ کلام میں بھی جا بہ جا انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے، مگر دشواری یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تصورِ علم کی وضاحت نہیں کی ہے۔ خواجہ غلام السیدین کے نام ان کے جو مکاتیب ہیں ان کے مطالعے سے ایک مقام پر انھوں نے نظریۂ تعلیم کے متعلق کچھ معنی خیز گفت گو کرتے ہوئے اپنے تصورِ علم کے بارے میں بھی چند جملے لکھے ہیں:

"علوم سے مراد وہ علوم ہیں جن کا دار و مدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک بڑی قوت ہاتھ آتی ہے، جسے یقیناً دین کے ماتحت ہونا چاہیے۔ علم اگر دین کے ماتحت نہ ہو تو محض شیطانیت ہے۔"

اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال ایسے نظامِ تعلیم کے حق میں ہیں کہ جو حسّی اور تجرباتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تصوراتی اور نظری علوم کو تعمیرِ ملت کے لیے چنداں مفید نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک وہ علم ہی نہیں جس سے عملی دنیا میں کام نہ لیا جاسکے۔ اس طرح سائنس اور ٹکنالوجی یا دوسرے استقرائی اور تجرباتی علوم ان کے نزدیک اس کے مستحق ہیں کہ انھیں نظامِ تعلیم میں نمایاں مقام دیا جائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید درس گاہوں کے نصاب میں تو یہی مضامین تھے، اس لیے ان کو جدید تعلیم سے شاکی نہ ہونا چاہیے تھا۔

دراصل ان کے نزدیک تعلیم مقصود بالذات نہیں۔ وہ تو جبلی صلاحیت اور ذاتی استعداد کو اپنی

اوراخلاقی قدروں کے ساتھ نمایاں کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی تحصیل سے اگر الحاد اور لادینی پیدا ہوتی ہے تو ان کے نزدیک نظام تعلیم کا یہ اہم نقص ہے۔ ان کے نزدیک ان علوم سے استفادہ کرنے والا اخلاقی اعتبار سے بشر کامل کی صفات کا حامل ہو اور اس کی خودی اتنی بیدار ہو جائے کہ وہ تسخیر فطرت کر سکے اور خود ناقابل تسخیر بن جائے۔

یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب علم کا وہ تصور ہو کہ جو اقبال نے اپنے مکتوب میں بیان کیا ہے۔ مسلم ممالک میں مغربی ٹکنالوجی کے بارے میں اس انداز فکر کی تشہیر کی گئی کہ مادی ترقی اس وقت ممکن ہے جب مذہب کی قید سے آزاد ہو کر اس کی تحصیل کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روح وجسم کی وحدت کا جو تصور اسلام نے دیا تھا، وہ باقی نہیں رہا۔ اقبال اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا　　آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل　　دنیا تو رہی، طائر دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی　　فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اقبال کامل میں ایسے متعدد اشعار نقل کرنے کے بعد ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ ہمیں اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اقبال علوم جدید کے مخالف تھے یا ان کی تحصیل کو گناہ سمجھتے تھے۔ وہ ہر اس علم کی تحصیل پر زور دیتے تھے کہ جو انسان کی خودی کو بیدار کر سکے اور اس کو اپنے ممکنات سے آگاہ کر سکے۔ عصر حاضر کے عقلی اور استقرائی علوم میں یہ اوصاف موجود تھے۔

لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان نوجوان اپنے مذہب پر عمل پیرا ہو، اپنی خودی کو یعنی اپنے تشخص کو نمایاں کرے اور وہ اخلاقی اقدار کے شعور سے محروم نہ رہے۔ چناں چہ ضرب کلیم میں جاوید کے نام جو نظم ہے اس کے یہ اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

جو ہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ
تو شاخ گل پہ چہکے، لیکن　　کر اپنی خودی پہ آشیانہ

ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انسان سب کچھ پڑھے، لیکن فکر و نظر اور اخلاق و عمل کے اعتبار سے مسلمان ہی رہے۔ ان کے بعض خطوط اور خطبات کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ تحصیل علم اور تربیت اخلاق کے متعلق اگر آیات قرآنی کے تقاضے اور مفہوم نیز اخلاق نبوی کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایک کامل نظام تعلیم و تربیت اسلامی ممالک میں نافذ کیا جائے تو مسلم معاشرے اور تمدن میں دوئی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور مسلمان اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے میں

کام یاب ہو سکتے ہیں۔

اقبال کا خیال تھا کہ اس تفریق کے خاتمے کے لیے مغربی طرز کے مدارس اور قدیم درس گاہوں کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کر کے اعلا نصب العین رکھنے والا کوئی ایسا مرکزی دار العلوم ہونا چاہیے جہاں افراد ملت کو جدید علوم کی تحصیل سے نہ صرف اپنی صلاحیتوں کے نشو و نما کا موقع مل سکے بلکہ وہ تہذیبی نظام اپنی ساری خصوصیتوں کے ساتھ سامنے آ سکے جسے ہم اسلام کا تہذیبی او رتمدنی نظام کہتے ہیں۔ یعنی خدا پرستی اور بندگی کامل کے ذریعے سے تسخیر فطرت اور دین و اخلاق کے تابع رہ کر تخلیقی سرگرمیوں میں انہماک۔

وہ شاہین بچوں کی پرواز کے لیے رفعت افلاک کو بھی کم سمجھتے تھے۔ قدیم طرز کی درس گاہوں میں علمی اور تخلیقی قوتوں کی بیداری کا کوئی سامان نہیں تھا، اس لیے انھیں شاہین بچوں کو خاک بازی کا سبق دینے پر دینی مکاتب سے شکایت تھی۔

ان کے خیال میں قدیم طرز کی درس گاہوں نے جمود زیادہ پیدا کیا اور ذہن کی اختراعی قوتوں کو بیدار کرنے پر زور کم صرف کیا۔

جدید طرز کے مکتب ذہنی جمود تو ضرور دور کرتے تھے، مگر یہ عمل منفی تھا، اس لیے کہ حرکت و سعی و عمل اور تخلیق پر دین و اخلاق کی کوئی گرفت نہیں تھی۔ وہ اپنی مادہ پرستی کی وجہ سے زندگی کے اس کلی تصور کی نمائندگی نہیں کر سکتے تھے۔ جو انھیں اسلام نے عطا کیا۔

بہر حال اقبال اور تعلیم پر کچھ لکھتے ہوئے جو بات مرکزی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال تعلیم برائے تعلیم کے قائل نہیں تھے۔ وہ تعلیم برائے تعمیر کے قائل تھے اور عصری علوم کے مخالف نہیں تھے، بلکہ دین و اخلاق سے اس کی بیگانگی پر معترض تھے۔ وہ ایسے نظام تعلیم کے آرزو مند تھے کہ جو مسلمان کو روح و جسم کے اتصال کے کامل شعور اور دین و دنیا کی وحدت کے عقیدے سے آشنا کر سکے۔ علم عملی دنیا میں صداقت اور اخلاق حسنہ کی صورت میں ظاہر ہو اور اس کا مقصد خدا شناسی ہو۔ انھوں نے بال جبریل میں اپنے تصور کی وضاحت مولانا رومؒ کے اس شعر سے کی ہے:

علم را بر دل زنی یارے بود　　　علم را بر تن زنی مارے بود

اقبال کی شاعری

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

(علامہ اقبال)

سرسید نے اردو ادب کو دانش وری کی نئی روایت سے روشناس کیا اور علامہ اقبال نے اس روایت کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ دانش وری کی یہ نئی روایت علامہ اقبال کی شاعری کا جوہر ہے۔ دانش وری کی نئی روایت ہے کیا؟ یہ نئی روایت دراصل منقولات کے ساتھ معقولات پر توجہ دینے سے عبارت ہے۔ منقولات پر پوری طرح اکتفا کرنا خالص تقلیدی عمل ہے اور ظاہر ہے کہ تقلید اپنی نوعیت میں تخلیق کی ضد ہے جب کہ شاعری یکسر عمل تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا عطیۂ الٰہی کا شکر بجالانے کے مترادف ہے۔ جو لوگ صرف منقولات پر بھروسہ کرتے ہیں وہ آخر کار لکیر کے فقیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ غالب اور سرسید سے پہلے ہمارے معاشرے کا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ ہم بدلتے ہوئے حالات سے بے خبر منقولات پر اڑے رہنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ غالب نے جب معاشرتی جمود کی یہ صورت دیکھی تو حضرت ابراہیمؑ اور آذر کی مثال دیتے ہوئے لوگوں کو یہ کہہ کر چونکایا کہ :

"ہر کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد"

یہ حالات دیکھ کر سرسید نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت میں ہمارے فکر و احساس اور ہمارے شعر و ادب میں ایک انقلاب لانے کی کوشش کی اور لوگوں کو عقلیت پرستی کی طرف راغب کیا۔ اگرچہ ان کوششوں کے نتائج ان کی زندگی میں بہ وجوہ پوری طرح ظاہر نہ ہو سکے، لیکن انھوں نے آنے والوں کے لیے راستہ ضرور روشن کر دیا۔ علامہ اقبال عقلیت پرستی کی اس راہ کے ایک

انتھک مسافر تھے۔ انھوں نے عقلیت پرستی کے رویّے کے خدوخال کو پوری طرح روشن کیا اور عقل کے ساتھ عشق اور وجدان کے اعلا مقام کی بھی نشان دہی کی اور فرمایا :

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

علامہ اقبال کے اس شعر میں عقلیت پرستی کی ایک نئی صورت ابھر کر سامنے آتی ہے جو انیسویں صدی کی عقل پرستی کے رویّے سے مختلف ہے۔ انیسویں صدی کو مختلف النوع سائنسی انکشافات کی بنا پر خالص عقل کی صدی کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس عقلی رویّے نے سائنسی علوم اور تجزیاتی انداز کو بہت ترقی دی جس کے سبب طرح طرح کی مشینیں ایجاد ہوئیں اور دنیا میں صنعتی انقلاب ممکن ہوا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عقل کو ایک مجرد حقیقت تسلیم کر لینا درست نہیں۔ عقل کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ ان حدود کے آگے اس کا عمل غیر موثر ہو جاتا ہے مشہور فلسفی کانٹ نے "انتقادِ عقلِ محض" (CRITIQUE OF PURE REASON) میں ان حدود کی نشان دہی کی ہے اور سببِ اوّل (A PRIORI) کو عقل کی رسائی سے ماورا ٹھیرایا ہے۔

بہرحال انیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں نے انسان کی نظر کو اس قدر خیرہ کر دیا تھا کہ وہ عقل کی ان حدود پر نظر ڈالنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اس انتہا پسندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ بیسویں صدی اپنے مزاج میں عقل کے خلاف جنگ کی صدی کہلاتی ہے۔ چناں چہ جدید فلسفیانہ رویّہ جسے وجودیت (EXISTENTIALISM) کہتے ہیں اپنی اصلیت میں غیر عقلی رویّہ (IRRATIONAL) کہلاتا ہے۔ علامہ اقبال نے انیسویں صدی کی عقلیت پرستی اور بیسویں صدی کے غیر عقلی رویّے کے مابین ایک ایسی راہ دریافت کی جہاں عقل کے خلاف کوئی ردّعمل بھی نہیں ہے اور اسے ادراک حقیقت کا واحد ذریعہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ علامہ کے نزدیک عرفانِ حقیقت کے لیے عقل سے بڑھ کر وجدان اور عشق کی ضرورت ہے۔ اوپر کے شعر میں علامہ نے اپنے اسی موقف کی نشان دہی کی ہے۔ ایک دوسرے شعر میں انھوں نے عشق و وجدان کی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے :

بے دھڑک کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں اپنے منفرد عقل و وجدان کے رویّے کو متخیلہ کی رنگ آمیزی سے ایک ایسا لہجہ عطا کیا جس نے مردہ دلوں میں زندگی کی دھڑکنیں پیدا کر دیں۔ فلسفے کو شعر بنا دینا ایک معجزہ ہے اور علامہ کی ساری زندگی اسی معجزے کا اظہار ہے۔ ان کے لیے یہ معجز بیانی

صرف اس لیے ممکن ہوسکی کہ انھوں نے عقلیت پرستی اور فطرت پرستی کی معنویت دریافت کرنے پر پوری توجہ دی۔ انھوں نے عقلیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے وجدان و عشق سے انکار کبھی نہیں کیا۔ اسی طرح انسان کو فطرت کا حصّہ سمجھتے ہوئے اسے فطرت میں گم ہوجانے سے بچانے کی کوشش کی۔ انسان کا فطرت میں گم نہ ہوجانا اس کی انفرادیت اور خودی کو برقرار رکھنے کی لازمی شرط ہے۔ علامہ کے نزدیک فطرت صرف موجود ہوتی ہے جب کہ انسان کی خودی کا تقاضا ہے کہ وہ اس صورت کی جستجو کرے جسے موجود ہونا چاہیے۔ بقول حالی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

علامہ نے اپنے اس فلسفے کو اپنے وجود میں اس طرح رچایا بسایا کہ وہ ان کے خون جگر کا حصّہ بن گیا اور آخر کار ان کے اپنے خون جگر کی نمود ان کا فن ٹھیرا۔ ان کے اس خون جگر کی نمود میں ہمیں حرکت و تغیر اور ارتقا کے ساتھ خودی اور عمل پیہم کے رنگ بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

خودی

علامہ کی شاعری میں خودی انسانی امکانات کی تفسیر اور انسانی عظمتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا اور اسے اشرف المخلوقات کی خلعت سے نوازا، وہ صرف مٹی کا ڈھیر نہیں ہوسکتا۔ قوت عمل اور صلاحیت تخلیق اس کے خمیر میں شامل ہیں۔ جستجو اس کی فطرت ہے اور ہر آن ایک نئی شان سے آگاہ ہونا اس کا تقاضا ہے۔ علامہ کے نزدیک اثبات خودی زندگی کا اصل محرک ہے اور زندگی مسلسل حرکت ہے۔ اس حرکت مسلسل میں انسانی خودی نت نئے مقاصد کی تخلیق کرتی ہے اور اپنے اس مسلسل عمل تخلیق سے خود کو وسعت دیتی اور بقا سے ہم کنار کرتی ہے:

خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے، بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

حرکت و تغیّر

علامہ اقبال زندگی کا اصولِ اول حرکت کو ٹھیراتے ہیں جب کہ قدیم یونانی فلسفے میں سکون کو اصل حقیقت بتایا گیا ہے۔ اگر ہم یونانی فلسفے کو تسلیم کرلیں تو پھر زندگی ویران ہو کر رہ جائے گی۔ ہر طرف بے عملی، بے حسی اور بے کیفی کی فضا چھا جائے گی۔ مسلمانوں میں جب تک عمل و حرکت کا دور دورہ رہا وہ دنیا میں سرفراز و پر وقار رہے، لیکن جیسے ہی یونانی فلسفے کے اثر سے ان میں سکونی نظریات مقبول ہوئے انھیں ہر قدم پر ذلت و رسوائی کا منھ دیکھنا پڑا۔ علامہ ایسے غیر اسلامی فلسفۂ تصوف پر سخت تنقید کرتے ہیں جو یونانیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں رائج ہوا۔ ان کی معرکۃ الآرا مثنوی "اسرارِ خودی" ایسے غیر اسلامی تصوف پر سخت تنقید ہے۔ جہاں تک اصل اسلامی تصوف کا تعلق ہے وہ نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اپنے مزاج میں مکمل صوفی ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں مولانا رومیؒ ان کے مرشد ہیں جس کا انھوں نے کھل کر اعلان بھی کیا ہے۔ حافظ کی شاعری سے بھی ان کا اختلاف صرف غیر اسلامی تصوف کے اثرات تک محدود ہے جب کہ حافظ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو وہ نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ اس کے پرستار بھی تھے۔ یونانیوں کے زیر اثر تصوف کے برعکس، ان کے نزدیک زندگی کی حقیقت حرکت و تغیر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ انسانی عمل ہے۔ اس کا ذکر وہ اپنی شاعری میں طرح طرح سے کرتے ہیں۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ میل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

زندگی کے حرکی تصور کی بنیاد پر انھوں نے تمدنی اوضاع کا بھی مطالعہ کیا اور پھر اپنے تصور کے تناظر میں فرد اور جماعت کے رشتے، آئین و ریاست کے مسائل اور دوسرے تہذیبی و معاشرتی سوالات کو اپنے لہو میں رچا کر شعر کی صورت دی۔ ان کی شاعری ہمارے فکر و احساس میں انقلاب کی نقیب اور اجتماعی طور پر ہمیں بیدار کرنے کے لیے ایک مہمیز ہے۔ ان کے دل میں ایک طوفان برپا تھا جس سے وہ پوری طرح قوم کو آشنا کرنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ لوگ ان کی شاعرانہ توانائی کو تو دیکھتے ہیں، لیکن ان کے اندر موج زن طوفان پر نظر نہیں ڈالتے :

کم نظر بے تابیِ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

ادیب وشاعر

ادیب وشاعر معاشرے کے معمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار اور اپنے ادب سے قوم کے ذہان کو غیر محسوس طریقے پر متاثر کرتے ہیں۔ ایک نظریاتی مملکت میں ادیبوں اور شاعروں کے تعمیری کردار کے ذریعے سے منزل تک پہنچنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

مولانا جلال الدّین رومیؒ

آٹھ صدیاں گزریں جب عالم اسلام کو ایک انتشار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ انتشار زبردست تھا اور اس کے اثرات بہت خطرناک اور دور رس تھے۔ یہ انتشار بیرونی طاقتوں کے عزائم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے پے بہ پے حملوں نے اسلامی دنیا کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مسلمان ایک بڑے پُر آشوب دور سے گزر رہے تھے۔ منفی تعلیمات اور منگولوں کے حملوں نے ان کو شکست خوردہ اور مردہ و افسردہ بنا دیا تھا۔ اسی دور میں مسلمانوں میں بعض بڑے بڑے علما و فضلا، شعرا، اہل فکر و نظر اور صاحبان بصارت و بصیرت پیدا ہوئے۔ ان میں شیخ سعدی شیرازی، محقق طوسی، شہاب الدین سہروردی، ابن عربی، عطار، عراقی، ابن بیطار اور جلال الدین رومی کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔

آپ یقیناً میری رائے سے اتفاق فرمائیں گے کہ جب تہذیب و تمدن اسلامی مٹائے جا رہے تھے اور اسلام کے مراکز تہس نہس اور علوم غرق آب کیے جا رہے تھے۔ اس دورِ پُر آشوب میں اگر ایسے دانش ور پیدا نہ ہوتے تو تاریخ اسلام قطعی طور پر اس سے مختلف ہوتی جیسی آج ہم جانتے ہیں۔ ہم یہ حالت مسلمان آج کے دور تک شاید نہ پہنچتے اور آج عالم اسلام جس پر آشوب دور سے گزر رہا ہے یہ وقت اور یہ دور آج سے کہیں پہلے آچکا ہوتا۔ مولانا رومی اسی پر آشوب دور کے دانش ور ہیں۔

ہمارے عہد کے علامہ اقبال کی طرح مولانا رومی کے فلسفیانہ خیالات بھی ایک تحریک بن کر ہمیں زندگی بھر جد و جہد اور سعی و کاوش میں لگے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ رومی نے طمطراق کی شاہانہ زندگی، گوشہ نشینی اور غیر متحرک زندگی گزارنے کی ہمیشہ مذمت کی۔ انھوں نے نصیحت کی کہ ہم ہمیشہ نیک مجاہدین کی طرح زندگی کی ہر منزل میں جہاد کرتے رہیں تاکہ ہماری زندگی کا اصل مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہ زندگی اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک سفر ہے اور اس ساری کائنات کے پس منظر میں محبت ایک طاقت بن کر کار فرما ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو ہمیں منزل آخرت تک لے جانے میں معاون ہوتی ہے۔

اگر ہم مولانا رومی کے اس پیغام بصیرت افروز کو سمجھ لیں ، ذہن نشین کرلیں اور اپنے دل میں اتارلیں تو ہم محبت کی بدولت اپنے خالق حقیقی تک پہنچنے کا نصف راستہ طے کرلیں گے اور جیسا کہ عظیم شاعر رومی چاہتا ہے ایک مکمل انسان بن جائیں گے ۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا خطاب کسی ایک مخصوص طبقے سے نہیں ہے بلکہ رومی ملت اسلامیہ کے ہر فرد سے بلکہ بہتر ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ تمام عالم انسانی سے خطاب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کبھی رنگ و نسل ، ملک و قوم اور کیش و مذہب کا فرق نہیں کرتے بلکہ آفاقی بلندیوں سے انسانیت کے قافلے کی رہنمائی کے لیے ضوفشانی کرتے نظر آتے ہیں ۔

ان حالات میں جب کہ مسلمان شکست خوردہ اور مردہ اور افسردہ تھے ، رومیؒ انحطاط پذیر اور زوال آمادہ ماحول کے خلاف جہاد کی تعلیم کا پرچم لے کر اٹھے اور انھوں نے ملت اسلامیہ کی مردہ رگوں میں پیمبرانہ اعجاز سے نیا خون حیات دوڑا دیا اور انھیں زندگی پر دوبارہ آمادہ کر دیا۔ رومی کی مثنوی نے جوان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے احیاے آدمیت کے لیے بے مثل کردار ادا کیا ہے ۔

جامی کا شعر ہے :

مثنوی و مولوی و معنوی   ہست قرآں درزبانِ پہلوی

خوش حال خاں خٹک

ایک ایسے سخت دور میں کہ شاید تمام عالمِ اسلام اپنے ماضی سے فکری طور پر منقطع ہے اور عملاً لاتعلق ہے، ماضی وحال کے تاریخی رشتوں کو جوڑنا، اور سلسلۂ تاریخ کی ٹوٹی ہوئی زنجیر اور اس کی کڑیوں کو جوڑنا، ایک ایسی تہذیبی کوشش اور ایک ایسی مربوط تاریخی جدوجہد ہے جس کی اہمیت اور ضرورت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

مطالعۂ تاریخ شاہد ہے اور حقائقِ تاریخ اس پر دال ہیں کہ وہ اقوام وملل ہمیشہ سربلند اور سرفراز رہتی ہیں کہ جو اپنے ماضی اور حال کے رشتوں کو پوری صلاحیت وجامعیت کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک رکھتی ہیں، جو اپنی روایات اور اپنی تہذیب وثقافت کی امین ہوتی ہیں اور اپنے ورثۂ علوم وفنون کی قدرداں اور ان کی محافظ ہوتی ہیں۔

پاکستان اور اہلِ پاکستان اپنے مرتبۂ اسلامی اور میدانِ اسلام میں اپنی شدید ذمّے داریوں کی وجہ سے اور اقدارِ اسلامی واخلاقی کے امین ہونے کی حیثیت سے احترامِ حقائق اور اکرامِ معارف کے پابند ہیں۔ علم وعمل کے میدانوں میں مثبت پیش رفت ہماری ایک بڑی خوش گوار ذمّے داری ہے۔ اس ذمّے داری سے خلوص ودانش کے ساتھ عہدہ برآ ہونا میری رائے میں ایک فرض ہے کہ جو ہر پاکستانی پر عائد ہوتا ہے۔ اہلِ وطن کو فکری رفعتوں کے ساتھ اور خلوصِ دل کی عظمتوں کے ساتھ فرائض ادا کرنے پر توجہ کرنی چاہیے۔

اس راہِ مستقیم پر ایک مثبت اقدام کے طور پر ہم اپنے ایک عظیم انسان، ایک بزرگ، ایک مجاہد، ایک رفیع شخصیت، صاحبِ سیف وقلم، بابائے پشتو شاعری خوش حال خاں خٹک کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ بابا خوش حال نے سنہ ۱۶۱۳ سے سنہ ۱۶۸۹ (۲۰ فروری) تک ایک ایسی زندگی گزاری کہ جو جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ صاحبانِ فکر ونظر، اہلِ بصارت وبصیرت اور علمائے تحقیق جانتے ہیں کہ اس شخصیت نے نہ صرف اس علاقے میں بلکہ برصغیر اور ممالکِ نواح پر کیا اثرات ڈالے ہیں۔ درحقیقت

ان اثرات و نتائج کا مطالعہ مزید دل چسپ ہے اور اس کی نتیجہ خیزی میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

اس شاعر کے بارے میں میرے جستہ جستہ مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ بابا خوش حال تیرہ سال کی عمر سے آخر دم تک ایک سعیِ پیہم، ایک جہدِ مسلسل کے حامل اور نمونۂ عمل رہے ہیں۔ ان خصوصیات کے بغیر کوئی انسان عظیم نہیں ہو سکتا اور جس ملت میں ایسے عظیم انسان نہ ہوں وہ خوش حال نہیں بن سکتی۔ سربلندی اور سرفرازی کے لیے فکر کی عظمت و صحت اور عمل کی قوت و شدت لازمی ضرورتیں ہیں۔ جو اقوام و ملل ان خصوصیات کی حامل رہیں اور ہیں وہ خلا نورد اور غیرتِ شمس و قمر ہیں۔ مگر جو ملتیں عظمتِ انسان اور شرفِ آدم سے محروم اور فکر و عمل سے عاری ہیں وہ باہم دست و گریباں اور دست نگر ہیں۔ شاید اس روشنی میں ہم اپنے حال پر غور کر سکیں۔

بابا خوش حال خاں خٹک ایک انسان میں جو خصوصیات دیکھنے کے آرزومند تھے وہ یہ ہیں:

★ حوادثِ زندگی کا مقابلہ کرنے کی جرات
★ صلاحیت کے ساتھ حالات سے نبرد آزما ہونے کی عظمت
★ شیرینیِ کلام
★ حسنِ اخلاق اور حسنِ سلوک
★ نمائش پسندی سے احتراز
★ کم گوئی اور بردباری
★ عزمِ بلند اور عملِ پیہم

بابا خوش حال خاں خٹک فکر و عمل کی قوتوں سے سرشار تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ میدان کارزار میں صاحبِ سیف اور دنیائے شعر و ادب میں صاحبِ دیوان تھے۔ وہ تلوار کے دھنی اور شاعرِ وطنی بھی تھے۔ اس سیف و قلم کے اتحاد نے اُن کی عظمتوں کو چار چاند لگا دیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سرحد کے اُس پار جس جہادِ عظیم کا اس وقت مظاہرہ ہو رہا ہے وہ تربیتِ خوش حال کا نتیجہ ہے۔ حی علی الجہاد کی یہ گوش شگاف صدائیں سارے عالمِ اسلام کے لیے دعوتِ فکر اور عالمِ انسانیت کے لیے وجۂ فکر ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری اور سیرت کے صحی و طبی مضمرات

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کے عوامی شاعر اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز صوفی کی حیثیت سے عالمی توجہ کا مرکز بنے۔ اپنے کلام اور اپنی تعلیمات کے اعتبار سے ان کا شمار ان اشخاص و اعلام میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ابنائے وطن کے اقلیم دل وجاں پر حکمرانی کی اور ان کی تہذیب و ثقافت کو جلا بخشی، نیز اپنے محبت آمیز نغموں سے دلوں کو تب و تاب اور سوز و گداز سے آشنا کیا۔

آج اگر وادی مہران انسانیت، محبت اور اخوت کی نغمہ خواں ہے تو اس کو دیگر اشخاص کے ساتھ سندھ کے ان معروف صوفی شاعر کا بھی فیضان کہہ سکتے ہیں۔ ان کے فکری نقوش کی تابانی اور معنی خیزی نے اہل مشرق ہی کو نہیں بلکہ مغرب کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔

جہاں تک ان کی حیات کا تعلق ہے اس کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ تصوّف اور شعر و سخن ہی کے حوالے سے کہا گیا جب کہ ان کی ذاتی زندگی اور شاعری میں ایسی تعلیمات بھی ملتی ہیں جو روحانی تزکیے کے ساتھ انسان کی جسمانی صحت کے رہ نما اصولوں کی بھی علم بردار نظر آتی ہیں۔

غالباً ایسا اس لیے ہوا ہے کہ جب ان کے ذاتی اور اخلاقی اوصاف کا مطالعہ کیا گیا تو یہ صرف اخلاقیات اور روحانیات تک محدود رہا۔ طبی نقطۂ نظر سے ان کے صحی اثرات و مضمرات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ حقیقت نگاہوں سے مخفی رہی کہ انسانی طرز حیات بھی صحت جسمانی اور صحت ذہنی کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔ شاہ بھٹائی کے تمام سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وہ نہایت وجیہ، بلند قامت، خوش مزاج اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ۶۳ سال کی عمر پاکر واصل بہ حق ہوئے۔ اس حقیقت پر بھی مورخین متفق ہیں کہ وہ اگرچہ ایک صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے، لیکن متمول اور باثروت طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تو خاندانی روایات

کے دائرے میں رہتے ہوئے امیرانہ تزک واحتشام کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایک مصنوعی اور پُرتکلف زندگی سے کنارہ کش ہوکر عالمِ فطرت سے اپنا رابطہ قائم کیا اور محلوں سے نکل کر صحراؤں میں خیمہ زن ہوئے۔

یہ نہ رہبانیت تھی نہ تجرید وتفرید بلکہ عوام سے قریب تر ہوکر ان کے دکھ درد سے آشنا ہونے کی ایک شعوری اور تجرباتی کوشش تھی۔ زیرلب ہی سہی یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ شاہ بھٹائی کی زندگی اہلِ ثروت کی عیش کوشیوں کے خلاف ایک احتجاجی صورت اور ان کے اخلاقی ذمائم کی اصلاح کے لیے عوامی تائید وحمایت کے ساتھ ایک موثر جدوجہد تھی۔ قابلِ رشک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے خود عملی طور پر ان اوصاف کو اپنا شعار بنایا جو عوام کی زندگیوں کے لیے بھی پیغامِ انقلاب ثابت ہوئے۔ ان اوصاف کو ہم قناعت، سادگی، صفائی، نظافت اور طہارت، پاکیزگی اور محبت، بے لوث خدمت گزاری اور دردمندی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس طرزِ حیات کی انقلابی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لیے اٹھارھویں صدی عیسوی کا وہ اجتماعی ماحول اپنے سامنے رکھیے جس پر اخلاقی اقدار واصول کی گرفت ڈھیلی ہوچکی تھی، طبقاتی تفاوت بڑھ چکا تھا، معاشرے پر بالا دست طبقے کو حکمرانی حاصل تھی اور غربا علم، صحت اور بہ قدرِ ضرورت روزی جیسی جائز مراعات سے محروم تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم صوفیا کی حیات وسیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کشف وکرامات پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان کی ان تعلیمات کی تشریح وتوضیح کی بہت کم کوشش کرتے ہیں جن میں انسانیت دوستی، صحت وعافیت، سکون وطمانیت اور خوش گوار زندگی کے آداب ونکات پنہاں ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہی کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اگر بہ امعانِ نظر دیکھا جائے تو ہم ان کے کارناموں کو ان کی انسانیت دوستی اور صحی تعلیمات کی روح قرار دے سکتے ہیں۔

آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے تمباکو نوشی کی ممانعت ان کی ذہنی اور فکری جودت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر تمباکو نوشی کی صحی مضرت کا صحیح اندازہ نہ تھا اور اس امر کا بھی احساس بہت کم تھا کہ آگے چل کر یہ ان منشیات کی ایجاد کا محرک بن جائے گا جو اجتماعی ہلاکت وتباہی کی موجب ہیں۔

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ عالمی معاشرے میں تمباکو نوشی کی مذموم عادت اور منشیات کی لعنت نے جو روحانی، جسمانی اور قلبی امراض پیدا کر دیے ان کا تصور ہول ناک ہے۔ آج افرادِ انسانی نے ہیروئن کی وجہ سے سرطان جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوکر نہ صرف صحت کا مسئلہ پیدا کر دیا بلکہ دہشت

گردی، تخریب کاری، ہلاکت خیزی، خودکشی اور خودسوزی، احساس وشعور کا تعطل، زندگی سے بے زاری اور احترام آدم وآدمیت کے فقدان جیسے اخلاقی مسائل سے بھی دوچار کر دیا۔ آج کا معاشرہ صحت واخلاق دونوں کے زوال وانحطاط کا بدترین نمونہ بنتا جارہا ہے۔ ہیروئن جو قبیل منشیات کی بدترین اور انسانیت کش عادت ہے، مشرق سے مغرب تک کے انسانوں کو اپنا صید زبوں بنا چکی ہے۔ عالمی ادارہ ہائے صحت اور اپنے وطن کی مختلف صحی تنظیمیں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ہیروئن کی بڑھتی ہوئی لعنت اور تباہ کاری سے لوگوں کو بچانے کی موثر جدوجہد میں مصروف ہیں، لیکن انسداد کی تدبیریں تاحال کارگر نظر نہیں آتیں۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے وہ تو ہیروئن اور دیگر منشیات کی بہ دولت جنازہ بردوش ہو ہی چکا ہے۔ مشرقی ممالک کی حالت بھی کم تشویش ناک نہیں ہے۔

عالمی ادارۂ صحت اور ذرائع ابلاغ نے ایک چھوٹے سے ملک نیپال کے بارے میں ہیروئن کی تباہ کاریوں کی جو تفصیلات پیش کی ہیں اور جو اعداد وشمار دیے ہیں وہ ہمارے تنبّہ کے لیے کافی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ:

"نیپال کی نصف آبادی کی عمر ۲۱ سال سے کم ہے یہاں کے نوجوانوں میں بھی نشہ آور اشیا کی لت بڑھ رہی ہے۔ اب زیادہ تر نوجوان ہیروئن کے اسیر ہو رہے ہیں۔ چند سال پہلے کھٹمنڈو میں صرف ۵۰ افراد اس کے عادی تھے۔ لیکن اب ۱۵ ہزار افراد اس بلا میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس شہر کے ہر بیس نوجوانوں میں سے ایک ہیروئن کا عادی ضرور ہے۔ ہیروئن کی اس بڑھتی ہوئی وبا کے اسباب میں مغربی تہذیب کا اثر ونفوذ اہم ترین سبب ہے جس کی وجہ سے لوگ آہستہ آہستہ اپنا تشخص بھولتے جارہے ہیں:"

یہاں دس ہزار تبتی باشندے ہیں جو اپنی قدامت اور ثقافت پرستی کے لیے مشہور ہیں لیکن اب ہیروئن کی وجہ سے وہ بھی اپنی ثقافت سے بے گانہ ہو رہے ہیں۔ مغربی تہذیب کی دل دادگی کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اکثر نوجوان بے روزگار ہیں اور غم روزگار کو بھولنے کے لیے ہیروئن استعمال کرتے ہیں۔ نفسیاتی اصطلاح میں اسے فرار، مایوسی اور بے زاری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس رپورٹ کے تجزیے سے جو خاص اور اہم نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ہیروئن کے استعمال سے تہذیبی وثقافتی تشخص کا جنازہ نکل رہا ہے۔

۲۔ ہمت کی پستی، مایوسی اور بے زاری انسانوں کا مزاج بنتی جارہی ہے۔

۳۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید اور نوجوانوں کی بے روزگاری اس مہلک وبا کو بڑھا رہی ہے۔
حقائق کے تجزیے کے بعد مجھے اس استفسار کا حق پہنچتا ہے کہ جو صورت حال نیپال کی پیش کی گئی ہے کیا احوال وطن اس سے بہت زیادہ مشابہ نہیں ہیں؟

مشرقی اور ایشیائی ملکوں میں بلکہ ساری دنیا میں ہر جگہ ہیروئن کے استعمال کا مسئلہ اس امر کا متقاضی ہے کہ علما اور مصلحین صورت حال کا نہایت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور ان اسباب اساسی کا کھوج لگائیں جو ہیروئن کے رواج اور ان کے استعمال کا سبب بنے۔ تمام ممالک میں یہ اسباب یکساں نہیں ہو سکتے اس لیے اپنے اپنے ملک میں اپنے اپنے انداز سے جائزے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں ہیروئن کا زور و شور ہے۔ ہیروئن کے خلاف متعین ادارے اور بورڈ بھی بہ ظاہر مستعد نظر آتے ہیں، مگر اس کے مہلک رجحان پر ان کی گرفت موثر اور مثبت نہیں۔ وہ قانون کے دائروں میں بھی صحت کار اور صحت رفتار کے عادی نہیں ہیں۔

یہ مسئلہ خالصتہً معاشی اور اخلاقی اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ قدرے سیاسی بھی ہے۔ ہماری سیاست نے اب تک نوجوانوں کو ان کی صحیح منزلِ مقصود تک نہیں پہنچایا۔ پاکستان کے علما اور صلحائے زوال اخلاق اور اس کے اسباب پر غور کرنا ترک کر دیا۔ مساجد و منابر ایسے ہاتھوں میں ہیں جن سے دیے جانے والے خطبات کا کوئی اثر نوجوان قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ان سے بیزار ہیں۔ اسلامی سوسائٹی میں اصلاح حال کے بنیادی مراکز مساجد صحت کے ساتھ استعمال نہیں ہو رہے۔ گزشتہ کئی ماہ و سال سے ہم نے پاکستان میں کسی سیاست داں کو ہیروئن کے مسئلے پر مضطرب نہیں پایا۔ سماجی تنظیموں کے مقاصد بھی اس مسئلے پر محیط نہیں رہے۔ کیا یہ سنگین صورت حال توجہ کی مستحق نہیں ہے؟ ہمارے لیے یہ بات جائے عبرت ہے کہ آج سے صدیوں پہلے تمام سائنسی اور عملی تجربات سے بے نیاز و بلند ہو کر سندھ کے ویرانہ و صحرا میں بیٹھ کر ایک درویش نے اس حقیقت کا اندازہ کر لیا تھا کہ تمباکو نوشی انسان کو مہلک منشیات کی طرف لے جا سکتی ہے اور اگر اس کے رجحان پر ضرب کاری نہیں لگائی گئی تو اجتماعی سطح پر اخلاقی، معاشی اور صحی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانا آسان نہیں ہوگا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ شاہ عبداللطیفؒ کا سب سے بڑا کشف اور ان کی انسان دوستی کی سب سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے؟ تو میں کہوں گا کہ تمباکو نوشی کی مضرت کا احساس اور اسی کی بنیاد پر دیگر منشیات کی ایجاد کے خطرات سے آگاہی عظیم مثال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے لوگوں کو تمباکو نوشی سے منع فرما کر صرف اہل سندھ ہی پر نہیں، بلکہ تمام انسانوں پر احسان کیا اور یہ ان کے انسان

دوست صوفی ہونے کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس وقت لوگ مظلومی اور محرومی کے شدید اور کربناک احساس میں مبتلا تھے۔ یہی وقت تھا کہ اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انھیں آراستہ کرکے۔ ان کے ذہن کو ماؤف ہونے سے بچاکر اور اسلام کے اصول طہارت ونظافت سے آشنا کرکے انھیں جسمانی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ایثار پسند شخصیت کی ضرورت تھی اور وہ شاہ بھٹائی کی صورت میں موجود تھی۔ ان کی قناعت نے دوسروں کو حرص وہوس سے پاک کرکے ذہنی اور نفسیاتی امراض سے بچایا۔ خاروخس سے وادیوں کو پاک کرکے محلوں کے بجائے فرش زمین پر صفائی کے ساتھ رہنا سکھایا۔ طبیعی مظاہر پر غوروخوض کی تعلیم دی۔ خود بھی تفکر اور مراقبے سے عالم طبیعیات سے قریب رہے اور دوسروں کو بھی قریب تر رہنے اور اسی میں اپنے دکھ درد کا مداوا ڈھونڈنے کی تعلیم دی۔ یہ ان کی تعلیم کا اثر تھا کہ صفائی وطہارت اور عالم فطرت کے قرب نے مصنوعی زندگی سے پیدا ہونے والے امراض سے عوام کو محفوظ رہنے کا ایک قرینہ سکھادیا۔ ان کی تعلیمات میں یہ بات بھی صحی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ وہ لوگوں کو تمباکو نوشی سے منع فرماتے تھے۔

تعمیری اور اصلاحی نکات پر مشتمل اپنی تعلیمات میں بھٹائیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک لالۂ خودرو صحرا میں مخالف اور ناساعد حالات کے باوجود اپنا حسن اور اپنی زیبائی قائم رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے اسی طرح ایک انسان محبت اور اخلاق کے ذریعے سے سخت مواقع ومشکلات کے باوجود اچھی اور خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے۔

چناں چہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سب مریدین اور معتقدین نے مادی وسائل سے محرومی کے باوجود ان کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اخلاقی خوبیوں کی بنا پر سکون وطمانیت اور صحت وعافیت کی زندگی گزاری۔ وسائل مادی کے نقصان کی تلافی سادگی، قناعت اور دوسرے اخلاقی محاسن سے ہوگئی۔ آج بھی اخلاقی اقدار صحت کے قیام اور جسم کو امراض سے پاک رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرسکتی ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ منشیات اور غیر اخلاقی طرز زندگی کی وجہ سے مادی وسائل کی فراوانی کے باوجود آج معاشرہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے سخت بیمار ہوچکا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ لاعلاج امراض کا شکار ہوچکا ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ سادگی، صفائی، طہارت اور فطری مقتضیات کے مطابق زندگی گزارنے کی عبداللطیف بھٹائیؒ کی اخلاقی اور صوفیانہ تعلیمات اپنے اندر زبردست صحی مضمرات رکھتی ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی، ایک پاک باز صوفی ہونے کی حیثیت سے بجا طور پر سرکار دوعالم صلی اللہ

علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا سچا اتباع کرنے میں انسانی معاشرے کی فلاح، نجات اور انفرادی و اجتماعی سکون و طمانیت کی برکت کو عیاں طور پر دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے اکثر اشعار میں رسمیت سے ہٹ کر اسلامی اخلاق اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ انھیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی وابستگی تھی۔ ایک بار مخدوم احمدی نے جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو بلا بھیجا۔ انھوں نے ایک شب کی مہلت مانگی اور کوئلے سے ایک ٹھیکری پر لکھ کر بھیج دیا:

"اس وقت تو نہ آؤں گا، صبح کے وقت آؤں گا، اے دوست! تم اس ذات کے ہم نام ہو جو کم زوروں کا بوجھ اٹھانے والے تھے"۔ (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

اپنے ایک مرید کو تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عشق و محبت میں اپنا سارا ساز و سامان قربان کر کے جد و جہد کے راستے پر کمربستہ ہو جا اور حسب و نسب کے تفرقات کو ترک کر کے حضورؐ کے تابع ہو جا"

ان کے اقوال اور ان کے کلام کے گہرے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو صحت مند اور مطمئن رکھنے کے لیے اس اخلاق کی تعلیم دیتے تھے جس کی قدریں اسلام نے پیش کی ہیں اور جس کا نمونۂ کامل ہمیں آں حضرتؐ کی حیات طیبہ میں ملتا ہے۔

انھوں نے تمام انفرادی اور اجتماعی امراض کا مداوا قناعت، سادگی، پاکیزگی، صفائی اور عالم گیر محبت میں ڈھونڈ لیا تھا۔ اسی لیے میں ان کے اشعار اور ان کے افکار کو طب و حکمت کے گہر ہائے آب دار سے معمور پاتا ہوں۔ میرے نزدیک یہی طرز حیات صحیح طرز زندگی ہے۔

غالب اور اس کی عظمت

غالب مغل سلطنت کے عہد زوال میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں مرہٹے، سکھ، راجپوت اور جاٹ چاروں طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص حصولِ اقتدار کے لیے کوشاں تھا۔ اس کے لیے لڑائیاں بھی ہوتی تھیں اور سازشیں بھی۔ وفاداریوں پر اعتبار اور اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ ایسے بادشاہ گر امیر پیدا ہو گئے تھے جو حسب مرضی بادشاہوں کو تخت پر بٹھاتے اور جب چاہتے لحد کی آغوش میں پہنچا دیتے۔ شاہ عالم کے دور میں سلطنت کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر ہو گئی تھی۔ وہ شاعر بھی تھے "آفتاب" تخلص کرتے تھے۔ زندگی کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا:

صبح گر جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

ظاہر ہے کہ ایسے حکمراں اپنے اقتدار کو زیادہ عرصے تک قائم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بااختیار نہیں محتاج اور مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی میں شاہ عالم کبھی نجف خاں کے محتاج رہے، کبھی مرہٹوں کے دست نگر اور کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے صاحب بہادروں کے وظیفہ خوار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ دہلی کا اقتدار دہلی سے پالم تک رہ گیا۔

شاہ عالم ثانی کے آخری دور میں مرزا اسد اللہ خاں غالب پیدا ہوئے۔ جب ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوا اور معین الدین اکبر ثانی تخت پر بیٹھے تو مغل شہنشاہ کا اقتدار سمٹ کر قلعۂ معلیٰ تک محدود رہ گیا تھا۔

غالب نے عمر کے گیارھویں سال میں شاعری شروع کی۔ اس زمانے میں لوگ پرانی لکیروں

کو پیٹ رہے تھے۔ شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔

بہت سے شعرا کا انداز تو ایسا تھا کہ اسے شاعری نہیں صرف پینترے بازی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا تعلق جذبات سے نہیں تھا، یہ محض صناعی تھی۔ آمد نہیں آورد تھی۔

غالب آگرے میں پیدا ہوئے۔ اپنے استاد محمد معظم کی صحبت میں انھوں نے بیدل کے کلام کا مطالعہ کیا۔ بیدل انھیں اپنے مزاج کے مطابق نظر آتے اور وہ ان کی طرز میں شاعری کرنے لگے۔ غالب کے اس دور کی شاعری میں لفاظی تھی۔ جذبات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پیچیدہ خیال اور مشکل ترکیبیں۔ وہ اس وقت بھی روش عام سے الگ تھے۔ اگرچہ بیدل ان کی افتاد طبع کے مطابق تھے، لیکن انھوں نے بیدل کو اپنی منزل نہیں بنایا کیوں کہ بچپن ہی سے ان کے دل میں آگے بڑھنے کا احساس اور جذبہ تھا۔ چناں چہ اُن کے زمانۂ جوانی کا ایک شعر ہے ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہی جذبہ اور تصور تھا ترقی کرنے کا آگے بڑھنے کا جس نے غالب کی رہ نمائی کی۔ انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش ہوئی اور اس طرح اپنی کوششوں میں آگے بڑھتے گئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے غالب علی کل غالب کی منزل تک پہنچے۔ گویا بیدل اس بلند عمارت کا پہلا زینہ تھے۔

لیکن تقلید کسی شخص کو بڑا آدمی نہیں بناتی۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے نئی فکر، محنت، مطالعے اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب کے مطالعے، شعور، تجربے اور مشاہدے نے ان کی رہ نمائی کی اور انھوں نے جلد ہی یعنی بیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی بیدل کی تقلید سے آزادی حاصل کرلی اور ہر بڑے آدمی کی طرح اپنا راستہ آپ بنا لیا۔

معین الدین اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دہلی کی حالت ہندستان کے دوسرے علاقوں کے مستقروں کی حالت سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ ہر طرف افراتفری، سازشوں اور اقتدار کی کش مکش کا بازار گرم تھا۔ ایسے ہی حالات دیکھ کر نوجوان غالب نے یہ شعر کہا ؎

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

یہ شعر اُن کے شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر غالب کی نظر وسیع نہ ہوتی اور وہ محض بیدل کی تقلید کرتے یا شاہ نصیر الدین اور ذوق کی بنائی ہوئی پامال راہوں کی تیلیوں میں پھنس جاتے تو آج وہ بھی اردو کے حشرات الارض جیسے شاعروں میں سے ہوتے۔ نہ کوئی ان کا نام لیتا نہ ان سے محبت کرتا اور نہ

آج ساری دنیا میں ان کی صدی منائی جاتی ۔

اگرچہ بچپن ہی میں وہ اپنے باپ اور پھر چچا کی محبت سے محروم ہو گئے، لیکن اُن کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ چوں کہ ان کے زمانے میں نئے اسلحہ یعنی توپ اور بندوق نے نیزے اور تلوار کا زمانہ ختم کر دیا تھا اس لیے انھوں نے فوراً ہی اپنے سو پشت کے پیشۂ آبا یعنی سپہ گری کو ترک کیا اور ترقی اور برتری حاصل کرنے کے لیے قلم کو اپنا رہ نما بنایا۔ نئے حالات کے مطابق نئے راستے بنانا اور نئی منزلیں تلاش کرنا موجدوں، بڑے شاعروں، مفکروں اور عظیم دماغوں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ پرانی چیزوں کو نئی شکل دیتے اور زمانے کی ضروریات کے مطابق بناتے ہیں۔ وہ ماضی کی طرف ہر وقت آنکھیں لگائے رکھنے کے بجائے حال اور مستقبل دونوں پر نظر رکھتے ہیں۔

غالب نے اپنی زندگی ہی میں کہا تھا کہ میرے اشعار کی قدر میرے بعد ہوگی۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کی نظریں مستقبل کی طرف تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرا دور ماضی پرست ہے، وہ حال کی قدر نہیں جانتا اور مستقبل کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس دور کی تنگ نظری سے واقف تھے۔ نئی ایجادوں کو دیکھتے، ان کی تعریف کرتے اور مستقبل کے بارے میں پُر امید رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آنے والا دور خوب سے خوب تر چیزیں لائے گا۔ زندگی آگے بڑھے گی۔ انسان آگے بڑھے گا۔ موجودہ جمود اور تنزل ختم ہو جائے گا۔ وہ اس حرکت کو دیکھ رہے تھے جو اس دور کے معاشرے میں آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی تھی اور بادشاہت سے جمہوریت کی طرف جا رہی تھی۔

لیکن یہ دور عجیب کش مکش اور تذبذب کا دور بھی تھا۔ معاشرے کی حیثیت سیلابی تھی۔ ماضی مر رہا تھا۔ مستقبل جنم لے رہا تھا۔ ایسا دور بڑا کرب ناک ہوتا ہے۔ بزرگوں کے دنیا سے رخصت ہونے کا غم دیکھا نہیں جاتا، لیکن نومولود کے آنے کی مسرت سے بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ غالب کے ذہن میں اسی قسم کی کش مکش تھی جب انھوں نے کہا ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

سفرِ زندگی میں کتنے ہی انسان ایسے ہوتے ہیں جو دوراہے پر پہنچ کر ایک عجیب گومگو کے عالم میں گرفتار ہو کر پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، پلٹ جاتے ہیں یا ایسی منزل اختیار کرتے ہیں جو کامیابی اور کامرانی کی طرف لے جاتی ہے، لیکن راستہ آسان نہیں ہوتا۔ راستے میں پھولوں کی سیجیں بچھی ہوئی نہیں ملتیں، کانٹے ہوتے ہیں اور جھاڑیاں۔ ہر لمحہ اور ہر قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غالب نے ایسا ہی راستہ اختیار کیا۔ چناں چہ اس دور کے لکیر کے فقیروں نے غالب کے اشعار سن کر فقرے بازی بھی کی اور مذاق بھی اڑایا۔ کسی نے بھینس کے انڈے سے روغن گل نکالنے کا مشورہ دیا۔ کسی نے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہہ کر جی ہلکا کیا۔ کسی نے اس نئے شاعر کو جو نئی زبان میں نئے خیالات پیش کر رہا تھا مہمل گو کہہ کر اپنے دل کو خوش کیا۔

منزل اگر متعین ہو تو خوف گم راہی نہیں رہتا۔ انسان منزل پر پہنچنے کے طریقے تلاش کرتا ہے۔ چناں چہ بیس پچیس سال کی عمر میں غالب نے فارسی کے بہترین شاعروں نظیری، ظہوری، عرفی اور حزیں وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ ان کی خوبیوں کو پرکھا اور ان کی کامیابی اور عزت کے راز سے واقف ہو کر ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

غالب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی پنشن کے سلسلے میں ناانصافی کے خلاف حصول انصاف کی خاطر دہلی سے لکھنؤ، کانپور، باندہ، الہ آباد اور بنارس ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ اس سفر نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ لعل نے اپنی قیمت کو پہنچنے کے لیے بدخشاں چھوڑا اور کثرت نظارہ نے چشم کو وا کر دیا۔

انھوں نے کلکتے میں نئی زندگی کی ہماہمی دیکھی۔ نئی ایجادیں دیکھیں۔ نیا رہن سہن دیکھا۔ نئے خیالات سے دوچار ہوئے اور محسوس کیا کہ یہی زندگی مستقبل کی زندگی ہوگی جس میں جمود اور افسردگی نہیں بلکہ حرکت اور گرمی ہے۔

اس وقت تک غالب صرف غزل گو تھے۔ قصیدے انھوں نے صرف حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی لکھے تھے۔ اب انھوں نے دوسرے فارسی گو شعرا کی طرح قصیدوں اور قطعات کو حصول معاش اور کار برآری کا ذریعہ بنایا۔ چناں چہ اس دور کے قصائد اور قطعات اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ قصائد کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ممدوح کی ستائش کم اور اپنے حالات زیادہ ہیں۔ شکایتیں ہیں اور انصاف کا مطالبہ ہے۔

لیکن ہر بڑے استاد کی مانند غالب نے صرف غزلوں اور قصیدوں ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قطعات، رباعیات، مثنویاں اور ترجیع بند وغیرہ بھی لکھے۔ انھوں نے نظیری، ظہوری، حافظ اور حزیں کی زمینوں میں غزلیں لکھیں، لیکن ان کا مقصد محض تقلید نہیں بلکہ اپنی شعر گوئی کی قوت کا اندازہ کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہ قول اعظم الدولہ سرور مولف عمدہ منتخبہ جلد ہی موجد طرز خود ہو گئے۔ حالی نے مرثیۂ غالب میں غلط نہیں لکھا:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

حالی نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے وہ غزل گو بھی تھے اور قصیدہ گو بھی، لیکن جو تنوع اور دلکشی غالب کی شاعری میں ہے وہ ان میں سے کسی کے ہاں نہیں۔ وہ محض مداح تھے، لیکن غالب محض مداح نہ تھے۔ ان کی شخصیتیں اور ان کا ادب اتنا پہلو دار نہ تھا جتنی غالب کی نظم و نثر۔ یہ لوگ جس معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے اس میں کوئی پہلو دار کیفیت نہ تھی۔ غالب کا معاشرہ پہلو دار تھا اس لیے غالب کی شاعری میں بھی یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس میں عیش و آرام اور فارغ البالی تھی، لیکن غالب ایک ایسے دور سے گزرے جس میں پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور نیا دور ایک صحت مند اور طاقت ور نوجوان کے مانند لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ غالب نے ماضی سے زبان لی اور نئی زندگی کی ترجمانی کی۔ ان کی آواز اپنے دور کی آواز تھی۔ اس وقت انگریزی اقتدار مغل سلطنت کو ختم کر کے بہادر شاہ ظفر کو قلعۂ دہلی سے بھی نکال دینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ دیسی معاشرے میں انگریزوں کے خلاف ایک لاوا پک رہا تھا۔ انھی حالات میں ۱۸۵۲ء میں غالب نے ایک غزل شاہی دربار میں پڑھی۔ اس کے چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شست بت ناوک فگن کی آزمائش ہے

غالب نے اپنی اس غزل میں دہلی کی سیاسی حالت کو پیش کیا ہے۔ یہ بت ناوک فگن انگریزی اقتدار ہے اور یہ کوہ کن خستہ کی وفاداری کا مطالبہ شیخ و برہمن سے کیا جا رہا ہے۔

لیکن انھیں اپنے زوال پذیر اور زوال آمادہ معاشرے کا بھی پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اب مغل سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا نہیں جاسکتا۔ جنون بریلوی کے نام ۱۸۵۳ء کے خط میں انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ "یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔"

انھیں اس معاشرے کی تباہی کا افسوس تھا، لیکن وہ قنوطی نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مرجھائے ہوئے پھول فنا نہیں ہوتے بلکہ آنے والی بہاروں میں پھر مسکراتے ہیں۔ وہ نہ آئین نو سے ڈرتے تھے اور نہ طرز کہن پر اڑنا پسند کرتے تھے۔ انھیں کھلنے والی کلیوں کو مسکراتے ہوئے دیکھنے کی آرزو تھی۔ وہ آرزوؤں کے بادشاہ تھے۔ آرزوؤں ہی سے تخلیق مقاصد ہوتی ہے۔

وہ راہبوں، زاہدوں اور سادھوؤں کی طرح کنج عافیت میں خاموشی سے بیٹھنے کو زندگی نہیں موت سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ آگے بڑھنا نئی آرزوئیں تخلیق کرنا اور نئے عزائم کی پرورش کرنا پسند کرتے تھے۔ سکون کے معنی جمود اور موت ہیں۔ غالب کی زندگی ایک متحرک اور پُرعمل زندگی تھی۔ یہی خصوصیت اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کا دماغ محشر خیال تھا۔ وہ ہزار چشم انسان تھے۔ وہ سب کچھ دیکھتے اور زبان سے اظہار خیال کرتے ؂

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے کہ وہ انسانی فطرت سے واقف تھے۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں تازگی اور شادابی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کی زنجیروں کو توڑا اور ہمارے دور میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی آواز ہمارے دل کی آواز بن گئی۔

غالب نے زندگی کو اس طرح دیکھا اور برتا تھا جس طرح آج ہم دیکھ اور برت رہے ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ ایک سدابہار کے مانند ہیں جس میں عشق پیچاں جیسے ننھے ننھے پھول بھی ہیں اور نرم و نازک اور سرخ شاداب گلاب جیسے پھول بھی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اشعار پڑھتے ہوئے غالب کا یہ شعر بے ساختہ ہماری زبان پر آجاتا ہے کہ ؂

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کا کلام اس قدر پہلو دار ہے کہ زندگی کے ہر دور میں ہمارے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ لڑکپن میں ان کے اشعار لفظی موسیقی کے باعث سمجھے بغیر ہی گنگنائے جاتے ہیں۔ جوانی میں ان کی عاشقانہ غزلیں اور زندگی سے متعلق جستجو آمیز خیالات جوان دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی نشاطی کیفیت زندگی کو شادمانی دیتی ہے۔ بڑی عمر میں ان کی خاموش سوچ اور بے آواز، لیکن بولتی ہوئی فکر یادوں کی برات کو ساتھ لیے نظروں کے سامنے سے چراغوں کے مانند گزرتی چلی جاتی ہے۔

وہ کہیں ایک خوش گفتار واعظ نظر آتے ہیں اور کہیں صوفی صافی۔ ان کی شاعری کے خوان پر ہر قسم کی نعمتیں موجود ہیں اور ہر ایک کو بہ قدر ظرف و ذوق حصہ ملتا ہے، رندوں کو بھی صوفیوں کو بھی فلسفیوں کو بھی اور عام انسانوں کو بھی۔ ان کی غزلوں اور خطوط میں ان کی خوش طبعی اور ظرافت بے ساختہ نعرۂ توصیف بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں بھی مسرت کے تارے مسکرانے لگتے ہیں۔ اُن کے مے خانے سے کوئی شخص تشنہ کام نہیں جاتا۔ یہی غالب کی عظمت کا راز ہے۔

غالب کی مقبولیت

اس وقت میرے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کا تعلق ادب سے ہے مگر ایسے ادب سے جس نے ہمیں بے ادب بننے سے روکا ہے۔ کتاب ایک ایسی چیز ہے جس کی تصنیف، ترتیب، اشاعت، طباعت تجارت اور مطالعہ سب کچھ نعمت ہے۔ کتاب سے متعلق کوئی کام کرنا ایک ایسی خدمت ہے جس سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس مسرت میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کتابوں کا موضوع اہم ہو اور کتابیں معیاری ہوں۔

جو کتابیں اس وقت میرے زیر مطالعہ ہیں ان کا موضوع غالب ہے۔ غالب کی مقبولیت میں سال بہ سال، ماہ بہ ماہ اور روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ یوں تو غالب کی عظمت ان کی زندگی ہی میں تسلیم کر لی گئی تھی، لیکن گزشتہ صدی کے آخر میں مولانا حالی کی کتاب "یادگار غالب" نے عظمت غالب کا ایسا نقش قائم کر دیا کہ ان کی عظمت میں آج تک اضافہ ہو رہا ہے۔ غالب کی شاعری دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز، خیال آفریں اور معنی خیز بھی ہے۔ غالب کی شاعری دل کو بھی مسخر کرتی ہے اور دماغ کو بھی متاثر کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسا سحر ہے جس نے ہر دور میں ہر پیر و جواں کو مسحور کیا۔ جس نے غالب کو پڑھ لیا وہ ان کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ غالب کی فکر میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کے تخیل میں پہنائی بھی ہے اور جولانی بھی۔ وہ کسی مخصوص فلسفے یا مکتب فکر کے نمائندے نہیں ہیں، لیکن ان کے فن میں زندگی کی وسعت، ہمہ گیری اور تنوع ہے۔ غالب کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی فطرت کے نباض معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے فن میں توانائی بھی ہے اور تازگی بھی انھوں نے اپنے دور کی روایتوں کو توڑا اور آنے والے دور میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی آواز نئے دور کی نقیب بن گئی۔ غالب نے اپنے دور میں زندگی کو اس طرح دیکھا جس طرح ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے سو سال گزر جانے کے بعد بھی ان کے اشعار میں ہمارے آج کے دور کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی ملتی ہے۔

اگر غالب کو نفسیات کے آئینے میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنی فکر اور اپنے فن کی برتری کا زبردست احساس تھا۔ اپنے اس احساس کے اظہار میں انھوں نے کبھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے خود اپنے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اُسے انھوں نے بڑی چابک دستی سے نبایا۔ غالب نے اپنے لیے جو راہ بنائی تھی اس کی صعوبتوں اور مشکلات سے وہ بے خبر نہ تھے۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ س راہ پر چلنا سخت مشکل کام ہے، لیکن انھوں نے اپنی راہیں خوب سوچ سمجھ کر متعین کیں اور اپنے اس انتخاب کو غالب نے اس طرح اپنے ذہن پر مسلط کر لیا کہ مشکل پسندی ہی ان کی فطرت اور پہچان بن گئی۔ مشکل پسندی کی یہ فطرت بے پناہ جرات کی خواہاں ہوتی ہے۔ غالب میں یہ جرات موجود تھی۔ انھوں نے اپنے فن اور اپنی فکر کو جن دشوار گزار راہوں سے گزارا ان پر غیر معمولی جرات کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب خود کو مشکل پسند سمجھتے تھے اور دوسروں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کو مشکل پسند سمجھیں۔ غالب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ کہا جانا باقی ہے، مگر یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ غالب خود شناس تھے۔ اسی خود شناسی نے ان میں خود اعتمادی پیدا کی جس سے کام لے کر انھوں نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا اور ایک منفرد فن تخلیق کیا، ایسا فن جو خود صاحب فن کی طرح بے مثال اور خود شناس ہے اور رہے گا۔ یہ انفرادیت جو اس فن اور صاحب فن کو حاصل ہے ان کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے اور آئندہ بھی زندہ رکھے گی۔

غالب جب تک زندہ رہے خود کو دنیا بھر سے منوانے کی کوشش کرتے رہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، مگر ان کی شاعری کی یہ کوشش آج بھی جاری ہے اور مجھے خوشی ہے کہ غالب اپنے فن کے ذریعے سے اس کوشش میں مسلسل کامیاب ہو رہے ہیں۔

غالب صدی کے موقع پر غالب پر اتنا لکھا گیا ہے کہ شاید ہی کسی ادیب یا شاعر پر اتنا لکھا گیا ہو۔ غالب صدی برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں پوری مہذب دنیا میں منائی گئی۔ بے شمار رسائل نے غالب نمبر نکالے، بہت سی نئی کتابیں، بہت سی پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن اور ہزاروں مضامین شائع ہوئے۔ لاتعداد اجتماعات اور مذاکرے و جلسے منعقد کیے گئے۔ غرض غالب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ کہا جاتے گا۔ تحقیق کے نئے گوشے اور تنقید کی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔ غالب کی اس مقبولیت میں ان کی خود شناسی کا بہت دخل ہے جس نے ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ میرے بعد میرے اشعار کی قدر ہوگی اور غالب صدی نے ان کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت کر دی۔

مختصراً غالب نے فن کو نیا زاویہ، زبان کو نیا لہجہ، فکر کو نئی سمتیں، غزل کو نئی وسعتیں اور اردو

نثر کو ایک انقلابی انداز بخشا۔ غالب کے گنجینۂ شاعری میں ہر نوع کی کیفیتیں موجود ہیں جن سے بہ قدر ذوق و ظرف ہر شخص لطف اٹھا سکتا ہے۔ یہی غالب کی غیر معمولی مقبولیت کا راز ہے۔

عبدالرحمان بجنوری نے دیوان غالب کو دوسرا آسمانی صحیفہ کہا تھا۔ اگرچہ ہم ان کے خیال سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کلام غالب کی مقبولیت کے اظہار کے لیے بجنوری کا خیال ایک استعارہ ضرور ہے۔ اردو دنیا کی جن شخصیتوں کے کلام کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کا بھی جامہ پہنایا گیا ان میں غالب کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہ بھی غالب کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔

صحافی و شاعر حسرت موہانی

کسی قوم کے لیے سب سے بڑا المیہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے منقطع ہو جائے اور اس روشنی سے محروم ہو جائے کہ جو حال کی راہیں اور مستقبل کی شاہ راہیں روشن کرتی ہے اور جو ان تاریکیوں کا پردہ چاک کرتی ہے جن میں بھٹک کر ملتِ راہ نورد اپنے مقصد کو بھلا دیتی ہے اور گم راہیوں کے فتنوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

زندہ قومیں اور ایسی قومیں جو اپنا مقصدِ حیات متعین کر لیتی ہیں، اپنے ماضی اور حال کے رشتوں کو ہر قیمت پر جوڑے رکھتی ہیں۔ جن مسلم اکابرین نے تحفظ ناموس اسلام اور طب و سائنس اور ادب و ثقافت میں عظیم کارنامے انجام دیے اور جن لوگوں نے عظمت اسلام، فکر و نظر اور علوم و فنون کے لیے عظیم قربانیاں دیں، اگر ہم نے ان کو فراموش کر دیا تو اس کا مطلب قطعی طور پر یہ ہوگا کہ ہم نے خود کو ایک نور مسلسل سے محروم کر دیا اور ضلالت و تاریکی کا لباس زیب تن کر لیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آزادی کی فضا میں سانس لینے والی ملت اسلامیہ یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ان اکابرین میں سے کسی ایک کو بھی فراموش کر دے جن کی رہ نمائیوں اور کارناموں کی وجہ سے آج وہ آزادیِ فکر کی دولت سے مالا مال اور سربلند ہے۔ ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم اپنے رجال عظیم کے کارناموں پر سے وقت کے پڑے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھائیں اور علم و فن میں ان کے کارناموں کے بنیادی حقائق کو روشنی میں لائیں۔

سید الاحرار مولانا حسرت موہانی ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جن کے کردار، سیرت اور شخصیت پر ہم نے اپنی غفلت سے گرد جما دی ہے۔ اگر ہم ان کی یاد تازہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنے ماضی اور حال کے اس رشتے کو جوڑنا چاہتے ہیں جو ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر اب تک ٹوٹا ہوا ہے۔

مولانا حسرت موہانی رئیس المتغزلین بھی تھے اور سیاسی رہ نما اور بطل حریت بھی۔ یہ سب صحیح ہے اور اسے سب جانتے ہیں، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ پکے مسلمان تھے۔ وہ ایک سچے مسلمان کی ان بنیادی خصوصیات اور صفات سے متصف تھے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا وصف

تھیں۔ صدق مقال اور اکل حلال ان کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ صدق وصفا اور مہر و وفا کے پیکر تھے۔ کلمۂ حق کے اظہار و اعلان سے انھیں بڑی سے بڑی طاقت بھی نہ روک سکتی تھی۔ اس راہ میں انھیں نہ جان جوکھوں میں ڈالنے میں تامل ہوتا تھا اور نہ مالی قربانیاں دینے میں تردد۔ غیر حق اور باطل سے مفاہمت ان کے لیے ممکن نہ تھی، خواہ بڑی سے بڑی مصلحت ہی کیوں نہ اس کی متقاضی ہو۔ سادگی مولانا حسرت موہانی کا طرّۂ امتیاز تھی۔ ظاہر و باطن کی یکسانیت اور دل و زبان کی مطابقت ان کے امتیازی اوصاف تھے۔ انھوں نے ایسا دل پایا تھا جو حرص و ہوس سے دور، مذہب و ملت کے درد سے رنجور اور محبت الٰہی اور عشق رسولؐ سے بھرپور تھا۔

مولانا حسرت موہانی نے انگریز کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی جب کہ ابھی نہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا تھا، نہ علی برادران میدان صحافت و سیاست میں کود ے تھے اور نہ مولانا ظفر علی خاں کی آواز سنائی دی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ابھی آزاد صحافت کے خار دار میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ علی برادران اپنی اپنی ملازمتوں سے وابستہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں دارالترجمہ حیدر آباد سے منسلک تھے۔ ڈاکٹر انصاری بیرون ملک طبّی خدمات میں مصروف تھے، اس وقت مولانا حسرت موہانی برطانوی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔

ذہنی دیانت داری اور اپنے نصب العین پر ایمان ہی ایک صحافی کو ابن الوقت اور زمانہ پرست ہونے سے بچاتا ہے۔ صحافی کے پاس ایک چھتری ہوتی ہے جو جذبات کی بوچھار سے سماج کو محفوظ رکھتی ہے۔ صحافی رائے عامہ کی روشن خیالی کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حسرت موہانی ایک عظیم صحافی بھی تھے اور انھوں نے ان اخلاقیات صحافت کو جنم دیا جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ مولانا پہلے مسلمان صحافی تھے جنھوں نے برصغیر کی صحافت میں سامراج دشمنی کی روایت قائم کی میری رائے میں ایک صحافی کو قلم کا دھنی اور شجاع ہونا چاہیے۔ دیانت داری اس کی ڈھال اور راست بازی اس کے نیزے کی انی ہونی چاہیے۔ اسے شریفوں کے ساتھ بااخلاق، عورتوں کے ساتھ باحیا اور منکسر اور بچّوں کے لیے شفیق ہونا چاہیے اور اسے مکار دھوکے باز عفریتوں سے باخبر ہونا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی میں یہ صفات موجود تھیں۔

میرا خیال ہے کہ ابھی تک کوئی عظیم شاعر ایسا نہیں گزرا جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی نہ ہوا اور نہ ایسا کوئی شاعر کبھی گزرا جس کا قلب صداقت آشنا نہ ہو۔ ایک عظیم شاعر کے سینے میں ایک آزاد اور حریت نواز کا سا دل ہوتا ہے، غیر فانی آتش سے سلگتا ہوا دل۔ سچے شاعر عظیم صداقتوں

سے محبت کرتے ہیں اور انھیں محسوس کرتے ہیں۔ بلاشبہ مولانا حسرت موہانی اردو کے ایک عظیم شاعر تھے۔ وہ اردو شاعری کی آبرو تھے۔ انھوں نے تغزل کی دنیا نئے سرے سے آباد کی ورنہ یہ صنف سخن ختم ہوتی جارہی تھی۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ سچے شاعر جو چیز اپنے نغموں سے سکھاتے ہیں پہلے اسے بڑے مصائب سے خود سیکھتے ہیں، اگر یہ سچ ہے کہ جو شاعر ہمت و مردانگی پر نظمیں اور غزلیں کہتا ہے وہ پہلے اپنی پوری زندگی کو ہمت و جرات کی نظم میں ڈھالتا ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ حسرت کو اس آئینے میں ضرور دیکھیے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مولانا کی سوانح حیات کو ان کی شاعری میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس میں ان کے تمام معتقدات کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی جن خوبیوں اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بجائے خود مولانا کو بقائے دوام کا خلعت پہنانے کے لیے کافی تھیں، لیکن ان کی جولانی طبع اور جوہر کردار کا یہ عالم تھا کہ کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لئے یہ وسعت مولانا کو میدان سیاست میں نظر آئی۔ مولانا نے سیاست کے خارزار سے دامن الجھایا، لیکن اس طرح نہیں کہ چند کانٹے چبھے تو پسپائی اختیار کرلی۔ ان کی بلند حوصلگی کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کانٹے شمشیر و سناں بن جائیں۔ چناں چہ انھوں نے کانٹوں کو شمشیر و سناں بنایا اور اردو کا یہ منفرد غزل گو شاعر مجاہدین حریت کی صف میں سب سے آگے نظر آنے لگا۔

مولانا حسرت موہانی کے سیاسی افکار و معتقدات سے ان کے زمانے میں بھی کچھ لوگوں نے اختلاف کیا اور یہ حق اب بھی ہر کسی کو حاصل ہے، لیکن اصول موضوعہ کی طرح ایک چیز ہر دور میں مسلّم رہی۔ وہ یہ کہ جس پامردی، دلیری، بے باکی، استقلال، ایثار اور عزیمت کے ساتھ انھوں نے برطانوی سامراج سے ٹکر لی وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا۔ ان کے نکتہ چیں اور مخالف بھی ان کی سیرت اور کردار کا یہ پہلو دیکھ کر ان کو خراج تحسین ادا کرنے اور سر نیاز خم کرنے پر مجبور رہیں۔

مولانا حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ برصغیر کی پہلی شخصیت تھے جنھوں نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کی کہ یہ جماعتیں درجۂ نوآبادیات کے بجائے آزادی کامل کو اپنا نصب العین بنائیں۔ بالآخر مسلم لیگ نے سنہ ۱۹۳۷ء میں کامل آزادی ہی کو اپنی منزل قرار دیا۔

ضرورت ہے کہ مولانا کے پیغام، ان کی شاعری، ان کے کارناموں اور آزادی کی جنگ میں ان کے مثالی کردار کو واضح کرنے اور اس کی اشاعت کے لیے مستقل کام کیا جائے اور اہل علم اس خدمت کو انجام دیں۔

حسرت موہانی کی عظمت

مولانا حسرت موہانی گفتار کے غازی بھی تھے اور صاحب علم وفن بھی تھے۔ خود ان کے بقول مولانا کی "طرفہ تماشا طبیعت" نے جہاں چمنستان شعر و ادب میں رنگا رنگ گل بوٹے کھلائے وہاں خارزار سیاست میں کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر لازوال نقوش بھی چھوڑے ہیں۔

جنگ آزادی میں ان کا جہاد، شاعری میں ان کا منفرد رنگ، ان کی خدا پرستی اور اسی کے ساتھ اشتراکیت پسندی مولانا حسرت موہانی کے کردار کی خصوصیات ہیں۔ یہ سب وہ اوصاف ہیں جو ہمارے کسی دوسرے رہ نما یا شاعر میں ایک ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ آج سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلنا تو کجا وہ نقش قدم یاد بھی نہیں ہیں۔ ہم نے جنگ آزادی کے دوسرے مجاہدوں کی طرح مولانا کو بھی بھلا دیا۔ حال آں کہ آج ہم جس آزادی سے مستفید ہو رہے ہیں وہ ان رہ نماؤں کی خدمات اور قربانیوں کی رہین منت ہے۔ اگر ہمارا یہی حال رہا تو شاید آئندہ نسل ان محسنوں کے ناموں سے بھی واقف نہ رہے گی۔ جہاں تک میرے محدود علم میں ہے ابھی تک اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے کہ اخلاق و آزادی کی جن قدروں کو مولانا نے زندگی بھر برتا ان کو مبسوط طریقے سے محفوظ کر لیا جائے۔ میرے خیال میں یہ بڑا المیہ ہوگا کہ ہم اپنے رہ نماؤں کی عظمت کا اعتراف نہ کریں۔

ہم یہ بھی بھولتے جا رہے ہیں کہ وہ عظمتیں کیا تھیں اور کن باتوں نے اُن کو رفعت بخشی؟ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم کسی سڑک کو ان کے نام سے منسوب کر دینے یا کسی پارک پر ان کا نام لکھ دینے یا زیادہ سے زیادہ سال بھر میں اُن کے نام پر ایک یوم منا لینے کو اپنی بہت بڑی کارگزاری سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان کے نام پر ایک یوم کا سالانہ انعقاد بھی چند سر پھرے لوگوں کی لگن اور ہمت کا نتیجہ ہوتا ہے ورنہ ہماری عیش پسندی اور آرام طلبی کی وجہ سے مولانا حسرت موہانی جیسی مجسم عمل ہستی کا تصور بھی شاید ہمیں گراں گزرے۔ ضرورت ہے کہ مولانا کی زندگی کے منتشر

اوراق کو پوری توجہ کے ساتھ جمع کیا جائے اور تاریخ آزادی کا جزو بنایا جائے۔

مولانا حسرت کے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان کی حق گوئی، بے خوفی، بے باکی، ان کی سادگی، سادہ مزاجی، دیانت، خودداری و بے نیازی، مستقل مزاجی، مشقت پسندی، صاف گوئی، سچائی اور سخت جانی ان کے کردار کی وہ خصوصیات ہیں جو ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں اور بننا چاہیے۔ ان کی یاد میں محض جلسے اور مشاعرے منعقد کر لینے سے مولانا سے عقیدت کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا سے عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کی عظمت کو سمجھیں، ان کی زندگی کو نمونہ بنائیں اور اس مقصد سے لگاؤ پیدا کریں جس کے لیے مولانا نے پوری زندگی جہاد کیا۔

حسرت موہانی ایک عظیم شاعر تھے اور انھوں نے اپنی سادہ اور پر مشقت زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیں شاعری کا حسن اور ذوق بھی عطا کیا۔

باباے اردو

باباے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کی عظمت اور بڑائی کسی اتفاق، کسی سہارے یا کسی سازش کا نتیجہ نہیں، بلکہ جو اپنے کاموں کی بنا پر بڑے ہوتے ہیں۔ ایسے بڑے آدمی دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑائی چھینی نہیں جا سکتی۔

باباے اردو میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ انھوں نے طویل زندگی گزاری اور اردو کی خدمت کرنے ہی میں گزاری۔ ان کی زندگی اردو تھی۔ ان کی توانائی اردو تھی۔ ان کی کم زوری اردو تھی۔ ان کی محبوبہ اردو تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو اردو کا غلام بنالیا تھا۔ خادم بن کر ہی آدمی مخدوم بنتا ہے۔ قوم نے ان کو باباے اردو بنایا۔

باباے اردو نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور آخری سانس تک وہ اردو کے لیے جیے۔ وہ فرماتے تھے کہ "میں اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنائے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا۔" اردو کے لیے جو تڑپ، لگن اور دھن ان میں تھی اس نے ان کو جوانوں سے زیادہ مضطرب، مستعد اور متحرک بنا رکھا تھا۔ باباے اردو سے مل کر بلکہ صرف ان کو دیکھ کر ہی زندگی کا اعتماد اور زندہ رہنے کا ولولہ پیدا ہو جاتا تھا۔

باباے اردو کی زندگی سے جو چیز ہر شخص سیکھ سکتا ہے وہ ہے زندگی کا ایک مقصد متعین کر کے اس کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دینے کا سبق۔ خوب سوچ سمجھ کر ایک مقصد حیات چن لیجیے پھر باباے اردو کی طرح اس مقصد کے علاوہ سب کچھ بھول جائیے۔ کام یابی کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔

سچ یہ ہے کہ کام یابی کا سہرا اپنے سر تو چھوٹے انسان باندھا کرتے ہیں بڑے لوگوں کو نام و نمود کی پروا نہیں ہوتی۔ باباے اردو کا ہر کام اردو کی بہتری کے لیے ہوتا تھا۔ وہ اردو ہی کے لیے ملتے اور اردو ہی کے لیے جھگڑا لڑتے تھے۔ ان کی دوستی اور دشمنی اردو ہی کے لیے تھی۔ اردو کا دوست ان

کا دوست تھا اور اردو کا دشمن ان کا دشمن۔

بابائے اردو میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ ان میں سے ایک خوبی چھوٹوں کی ہمّت افزائی کرنا اور ان کا دل بڑھانا تھا۔ اردو کے لیے کسی نے ذرا سا بھی کام کیا تو بابائے اردو نے اس کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ وہ واقعی کام کا آدمی بن گیا۔ انھوں نے اس طرح نہ معلوم کتنوں کو بنایا۔ ان کی حوصلہ افزائی نے بہت سوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ اور آگے بڑھنے کا ولولہ عطا کیا۔

بابائے اردو بجائے خود ایک تحریک تھے۔ ان کو یاد رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اردو کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ جو کام وہ اپنی زندگی میں پورے نہ کر سکے ان کو پورا کیا جائے۔ اردو کی دشمنی یا نادان دوستی کو ترک کیا جائے۔ زبان کو زیادہ توانا اور متنوع بنایا جائے اور اردو کے نام سے شرمانے کے بجائے اس پر فخر کرنا سیکھا جائے۔

سیماب اکبرآبادی

میں اس خیال کا حامی ہوں کہ جو قوم تعلیم کی مشکلیں نہیں جھیلتی وہ ہمیشہ جہالت کی ذلّت جھیلا کرتی ہے۔ جب جہالت اور ذلّت کی بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے اپنے ملک کے حالات کا خیال آتا ہے اور اپنے گریبان میں منھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہ ظاہر ہم اپنے نظام تعلیم کو جن خطوط پر استوار کرنا چاہتے ہیں وہ فقط لباس و انداز کی تبدیلیوں کے ساتھ ہنوز وہی ہیں جو ہم نے آزادی کے بعد اختیار کیے تھے او فکر و نظر میں آج تک کوئی اساسی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ شاید آپ میری اس رائے سے اتفاق فرمائیں کہ ہمیں اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہم پاکستان کے موجودہ بے مقصد اور نظریۂ حیات ملّی سے متضاد و متغائر نظام تعلیم میں ایک ایسا انقلاب لائے بغیر کہ جو نظریۂ حیات ملّی کا آئینہ دار اور نقیب ہو، کوئی تعمیری پیش رفت نہیں کر سکتے۔ ہمارے معاشرے میں موجود تعلیم و تعلّم کا عدمِ احترام ہمیں منزل مقصود تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اگر ہم نے صورت حال پر دل و جان سے اس طور غور نہ کیا کہ پاکستان اور اہل پاکستان دونوں کا اقوام و مللِ عالم میں عدم تشخص علم و عالم کی ناقدری و ناسپاسی کا لازمہ ہے تو ہم پاکستان میں ہرگز اسلامی انقلاب برپا نہیں کر سکیں گے۔ شاید آپ اس اندازِ فکر کو اہمیت دیں کہ علم و عالم اور علم دوست کی تحقیر سب سے بڑا گناہ ہے۔ عالِم کی تحقیر سے ذہن بگڑ جاتا ہے اور علم دوست کی تحقیر سے محبت ختم ہو جاتی ہے۔

چند دن ہوئے کسی اخبار میں حضرت سیماب اکبرآبادی کے مزار کے بارے میں حالات پڑھے تھے۔ میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں ان حالات سے عرصۂ دراز سے واقف اور آگاہ ہوں۔ مگر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اب ہم ترقی کے ایسے مقام تک جا پہنچے ہیں کہ نہ تو زندگی میں اپنے اکابر رجال کی قدر کرتے ہیں اور نہ ان کے مرنے کے بعد اُن کی عزت کرتے ہیں اور اب تو یاد بھی کوئی نہیں کرتا، اُن کو مشعل راہ بنانا تو بڑی دور کی بات ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک وقت تھا کہ حالات ایسے تھے کہ کسی پہنچے ہوئے پیر کی تلاش میں لوگ سرگرداں رہا کرتے تھے۔ قدرتی موت واقع نہ ہوتی تو از راہ احترام ان کی ہلاکت کا سامان کر کے اپنے علاقے میں پیر و بزرگ کی قبر تیار کراتے اور اُسے مرکزِ احترام قرار دے دیا کرتے تھے۔ اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ سیماب اکبرآبادی نہ جانے کہاں پڑے ہیں۔ نہ اہل دل کو ہوش ہے اور نہ اہل قلم کو۔ نہ شاعر کو نہ ادیب کو اور نہ ان بوالہوسوں کو جو دعوے دارِ عشق تعلیم ہیں۔ حضرت سیماب اکبرآبادی نے جو خدمت علم و ادب کی کی ہے ،میرا اس پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا۔

علامہ سیماب اکبرآبادی نے تقلیدِ مغرب کی انتہا پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ انھوں نے روایتی اصناف کو نئے انداز سے برتنے پر توجہ مرکوز رکھی اور فانی، یگانہ، حسرت، حفیظ جالندھری، اصغر اور جگر کی طرح اردو غزل کا نیا پیکر تراشنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

حضرت سیماب اکبرآبادی کو زبان و بیان کے سلسلے میں درجۂ استاد حاصل تھا۔ وہ علم عروض کے نہ صرف منتہی تھے بلکہ انھیں فی البدیہہ شعر کہنے پر بھی اس قدر ملکہ حاصل تھا کہ مشکل سے مشکل بحر میں بے تکان اور مسلسل شعر موزوں کرنا ان کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے کچھ نام ملک گیر شہرت کے حامل بھی تھے ،مثلاً ساغر نظامی ہی کو لے لیجیے جن کے شعری اور نثری کارناموں کو آج بھی بہ نظر وقعت دیکھا جاتا ہے۔

حضرت سیماب اکبرآبادی کو شاعری کے علاوہ تصوف سے بھی گہرا شغف تھا اور وہ وارثی سلسلے کے لائق احترام خلفا میں شمار کیے جاتے تھے۔ تصوف نے ان کے دل میں عشق رسول ؐ کی چنگاری جس آب و تاب سے روشن کی تھی اس کا اندازہ ان کے نعتیہ کلام سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ نعتیہ شاعری میں وہ اردو کے چند بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔

آج کل ہمارے بہت سے جدید شاعروں نے زبان و بیان سے بے اعتنائی برتنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ ایسے دور میں علامہ سیماب جیسے اساتذۂ زبان کا کلام بلاشبہ مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات و تصانیف ہمارا تہذیبی ورثہ ہیں جس کی حفاظت ہمارا قومی فرض ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے اب تک اس طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ سیماب اکادمی پاکستان کے زیرِ اہتمام ہر سال ان کو یاد کرنے کی تقریب منانا ہر چند ایک مستحسن کام ہے لیکن ہمیں صرف ان تقریبات ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کی شاعری اور فن شاعری کے بارے میں ان کے خیالات کی ترویج و اشاعت کی بھی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔

ایک بات یہ بھی کھٹکتی ہے کہ ہمارے فکر و قلم، ہمارے شعر و ادب اور حالاتِ ملک و ملّت کی رفتار میں یکسانیت نہیں رہی۔ بعض حالات میں رفتاروں میں بڑا فرق ملتا ہے اور ایسے سنگین حالات کا بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ فکر و قلم اور علم و عمل کے رُخ غیر متعین ہوتے ہیں اور سمتیں مختلف۔ ایک طرف ناقدریٔ علم اور ناشناسی عالم کا عالم ہو اور دوسری طرف فکر و نظر میں یکسانیت باقی نہ رہے تو تعمیر قطعی مشتبہ ہوجاتی ہے، بلکہ حالات کی یہ سنگینی قوت تعمیر کو مفلوج کر دیتی ہے۔ بہ ایں ہمہ ایسے صاحبانِ عزم و عظمت بھی پیدا ہوئے کہ سمندر کے بہاؤ کے خلاف جنھوں نے غواصی کی ہے اور پوری جرات کے ساتھ دریاؤں کے رُخ موڑے ہیں۔ خود اس دور میں بھی ایسے عظیم انسان موجود ہیں اور یہی وہ بزرگ ہیں جن کی وجہ سے اس وطن کے آدھے حصے کا وجود برقرار ہے۔ مگر ان کی تعداد کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہے اور ان کی توانائیاں شدت طاغوت کا مقابلہ نہیں کر رہی ہیں۔ شاید ایسے ہی حالات تھے کہ غازی صلاح الدین ایوبی نے کہا تھا کہ مجھے صلیبوں کی یلغار کی قطعی پروا نہیں' پریشانی یہ ہے کہ کفار کی یلغار کو روکنے والے شراب کے مٹکوں میں ڈوب گئے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ وقت ہے کہ اہل فکر و نظر اپنی توانائیوں اور طاقتوں کو مجتمع کریں اور ایک انقلاب کی تیاریاں کریں۔

ایک لمحے کے لیے بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عوام کو صرف خیالات بیدار نہیں کرسکتے، بلکہ تحریک عمل اور پوری قوت سے آگے بڑھنے کا جذبہ بیدار رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اصول ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہم نفرت سے نفرت پر فتح حاصل نہیں کرسکتے۔ ناراض کو محبت سے، برے کو نیکی سے اور جھوٹے کو صداقت سے رام کرنا ہوگا۔

حضرت سیماب اکبرآبادی سے میری پہلی ملاقات کا حال بھی کم دل چسپ نہیں ہے۔ ہمدرد منزل دلّی میں، میں اپنے استادِ گرامی کے سامنے زانوے ادب تہ کیے بیٹھا تھا اور عربی صرف و نحو موضوع تعلیم و تعلم تھے۔ اس حال میں ایک بزرگ تشریف لائے، چق اٹھائی اور اندر۔

السلام علیکم

وعلیکم السلام

جناب حکیم عبدالحمید صاحب سے ملنا ہے۔ انھوں نے چھ بجے کا وقت دیا تھا۔

آپ تشریف رکھیے۔ اگر حکیم صاحب نے ۶ بجے کا وقت دیا تھا تو وہ ضرور ۶ بجے آپ سے ملیں گے۔

یہ اگر کیا ہے، بھئی واقعہ ہے کہ ۶ بجے کا وقت دیا ہے۔ اگر کا کیا سوال۔

حضرت سیماب اکبرآبادی بگڑ گئے۔ وہ وقت سے تین منٹ قبل تشریف لائے تھے۔ ابھی وہ گرم

ہی تھے کہ ٦ بج گئے اور حکیم عبدالحمید صاحب تشریف لے آئے۔ سیماب قائم النار ہوئے اور اگر مگر کا یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔

درحقیقت شاعر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سچا اور صادق ہوتا ہے۔ اس کی سچائی اور اس کا صدق اور دیانت ہی اسے فرش سے عرش تک لے جاتے ہیں اور اس کی تعمیری صلاحیتیں اور عظمتیں فلاح ملک و ملت کا سبب بن جاتی ہیں۔

اگر کسی شاعر سے اس کا یہ وصف چھین لیا جائے یا وہ خود اس سے محرومیوں کا سامان کرے تو پھر شعر و شاعری اور شاعر کا زوال لازمی ہے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شعر و شاعر کا زوال اور اہل فکر و قلم کا اضمحلال کسی ملت اور کسی امت کے لیے وجہ خیر نہیں ہوسکتا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر ہمارے پاکستان میں قلم و فکر کا بھاؤ تاؤ نہ ہوجاتا اور فکر و قلم جولانیوں کے لیے آزاد اور قیود اسلامی میں بند ہوتے تو پاکستان دولخت نہیں ہوسکتا تھا اور نصف پاکستان منتشر و مضطرب نہیں ہوسکتا تھا۔

میں شاعری فکرِ عظیم اور قلم کی طاقت کا معترف ہوں بہ شرطے کہ یہ دیانتوں کی دنیا میں آباد ہوں اور صدق و صفا ان کا مزاج اور شرفِ انسان ان کا منتہائے مقصود ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ہمیں دیانت و امانت اور صدق و صفا کا پاک ماحول پیدا کرنا چاہیے اور اقتدار کو اس کوشش میں بہ خلوصِ قلب و نیت شریک ہونا چاہیے۔ باور کرنا چاہیے کہ سچائیاں پتّوں کی طرح لاتعداد ہیں اور اُن کا شمار انسانی عقل کے بس کی چیز نہیں۔

یا درفتگاں کے بعض لوگ قائل نہیں۔ مگر وہ صاحبانِ فکر و نظر جو ماضی، حال و مستقبل میں ربط و ضبط کی اہمیت کو جانتے اور سمجھتے ہیں اہلِ نظر اُن کی سلامتیٔ فکر کو فال نیک سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ماضی کی روشنی سے حال کو روشن کرنا مشکل ہوگا اور ماضی و حال اگر روشن نہ رہے تو مستقبل کی تابانیاں مشتبہ ہوکر رہ جائیں گی۔ بہ حیثیت ملت اور بہ حیثیت امّت ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ماضی سے اپنا ہر رشتہ توڑ لیا ہے۔ زنجیر تاریخ کی ہر کڑی ٹوٹ گئی ہے اور ماضی کلیتہً تاریکی میں چلا گیا ہے۔ اس تاریکی میں شب خون پڑے اور پڑ رہے ہیں اور اسلامی دور کی ہر دانش اور مسلمانوں کی ہر علمی پیش رفت مغرب میں چلی گئی اور ہم حال کی چکا چوند سے خیرہ ہوکر رہ گئے۔ یہ خیرگی عظمت مغرب کے جلو میں آئی اور اس نے ہماری بصارت اور بصیرت دونوں کو متاثر کیا۔ شاید یہی وقت ہے کہ ہم اعلا کردار رکھنے والے دوست اور بہترین دماغ والے دشمن چنیں اور اپنی راہوں کا تعین کریں۔

مجنوں گورکھپوری

گزشتہ ماہ جب مجھے ابن خلدون پر ملی سطح پر کچھ کام کرنے کا موقع ملا تو اس دوران کتاب کے مقدمے کا ایک جملہ میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ جو معاشرہ علم و عالم کا پاسبان نہ ہو اور علم و عالم کی قدردانی سے محروم ہو وہ نہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ سربلند و سرفراز ہو سکتا ہے۔ اس ایک جملے میں جہانِ معنی پنہاں ہیں۔

کسی قوم کی اخلاقی و معاشرتی حالت کا اگر آپ صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ اس قوم کے افراد میں احترام اکابر اور اعتراف کمال کا جائزہ لیں۔ یہی وہ بہترین اشاریہ ہے جس سے آپ کو نہ صرف اس کے حال کا صحیح علم ہو جائے گا بلکہ آپ اس کے ماضی اور مستقبل کا اندازہ بھی لگا لیں گے۔ جو قومیں اپنے بزرگ خصوصاً اہل علم کے اعتراف عظمت میں بخیل نہیں ہوتیں اور علم و عالم کا احترام کرتی ہیں، وہی سفر زندگی میں فتح و ظفر کی حق دار ہوتی ہیں۔ جو قومیں اپنے اسلاف و اکابر کے فضل و کمال کی معترف ہوتی ہیں اور ان کے روشن کارناموں سے فائدہ اٹھاتی ہیں وہ کبھی احساس کم تری کا شکار نہیں ہوتیں اور راہ حیات میں بڑے اعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتی ہیں۔ ہم ایک عرصے تک غلامی کے اثرات میں مبتلا رہے اور صرف دوسروں سے کسب فیض کو اپنے لیے مفید سمجھتے رہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ اب ہم اس دل دل سے نکل رہے ہیں اور کم سے کم یہ احساس ضرور پیدا ہو رہا ہے کہ اعتراف عظمت ہم میں ویسا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ چناں چہ اپنے بزرگوں کے جشن منانے کی روایت کا آغاز اسی احساس کی عکاسی ہے۔

عالم شناسی یا مجنوں شناسی دراصل تلاش علم اور ادراک جوہر کا ایک حصہ ہے۔ کسی عالم کی قدردانی اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ ہمیں جہل سے نہیں، علم سے نسبت ہے اور اسی لیے ہم میں عالم پیدا ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں مجنوں شناسی دراصل ہماری خود شناسی کا ایک اظہار ہے۔ جب ہم مجنوں صاحب

کو یاد کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ مجنوں صاحب نے ادب اور زندگی کو اتنا دیا ہے کہ ادب دوست اور زندگی دوست ان کے احسان کے آگے سر نہیں اٹھا سکتے۔ کسی معاشرے میں ادیبوں اور عالموں کا وجود اس معاشرے کو تاریکی سے بچاتا ہے۔ کسی ملک کا تشخص وہاں کی بلند عمارات اور کشادہ شاہراہیں نہیں ہوتیں بلکہ اس کی بلند اور قدآور علمی شخصیات ہوتی ہیں۔ مجنوں صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی قدآور شخصیت ہے جن سے ہمارے ملک کے تشخص کی پہچان ہوتی ہے۔

حضرت مجنوں گورکھپوری ہمارے اکابر ادب میں شامل ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس عرصے میں انھوں نے افسانہ، تنقید اور تاریخ ادب میں طرح طرح کے پھول کھلائے۔ حضرت مجنوں کا شمار ان ستونوں میں ہوتا ہے جن پر جدید ادب اردو کی عمارت کھڑی ہے۔ انھوں نے ادب کی خدمت اپنے خونِ جگر سے کی اور کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کو مجنوں صاحب سے بڑی عقیدت اور محبت ہے اور آج کا اردو ادب ان کی ادبی کاوشوں کا احسان مند ہے۔ اردو کے جدید ادب کی تاریخ میں مجنوں صاحب کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

صحافت

صحافت سماجی اور تہذیبی زندگی کا خوب صورت نقش اور جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ یہ انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی اور سماجی رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے، فرد کو واقعات و حقائق سے آگاہ کر کے معاشرے کے لیے اس کی ذمّے داریاں یاد دلاتی ہے۔

صحافت — عنوانِ تعمیرِ ملّت

علوم و فنون پر محاکمہ، تاریخ پر عبور، زبان پر قابو، ضمیر کے لیے میزانِ عدل اور عصمتِ قلم ایک صحافی کی بنیادی صفات ہیں۔ ان کے بغیر صحافت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات صحیح ہے کہ قلم ایک طاقت ہے اور اس قلم کو اخلاق مل جائے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔ ایک اہلِ قلم اخلاق و کردار کی طاقت کے ساتھ اگر برسرِ عمل ہو جائے تو فکری انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ اگر یہی قلم صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے منحرف ہو جائے تو تخریب کی کوئی حد نہیں رہتی۔

صحافت عصری تہذیب کا جزو لاینفک ہے۔ ہم عصری تہذیب کو صنعتی تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر تہذیب کی طرح اس کے بھی دو اہم شعبے ہیں ایک سیاسی اور دوسرا معاشرتی۔ ہر تہذیب میں ان دونوں شعبوں کے مابین ایک ربطِ خفی ہوتا ہے جو ان بظاہر الگ الگ شعبوں کو کل یا وحدت کی صورت بخشتا ہے۔ صنعتی تہذیب کا سیاسی نظام جمہوریت ہے جو رائے عامہ پر استوار ہوتا ہے، جب کہ معاشرتی نظام سائنسی رویّے پر مبنی ہوتا ہے۔ جمہوریت اور عقلیت دونوں کی ترویج و اشاعت اور فروغ و ترقی کی لازمی شرط تقریر و تحریر کی آزادی ہے۔ اس کا سب سے مؤثر وسیلۂ اظہار صحافت ہے۔ ہم آزادیِ تحریر و تقریر کی اہمیت کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کر سکتے ہیں کہ یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے ان میں ہر طرف آزادی تحریر و تقریر ہی کا مطالبہ گونجتا سنائی دیتا تھا۔ اس سلسلے میں لوگوں کو سخت سے سخت آزمائش سے گزرنا پڑا اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنی پڑی، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آزادی کے متوالے نہ کسی آزمائش کو خاطر میں لاتے اور نہ کسی قربانی سے گھبرائے۔ ان متوالوں کے جوش، ولولے، عزم اور حوصلے کے سامنے اقتدارِ شاہی تک کو جھکنا پڑا اور آزادیِ اظہار کو انسان کے مقدس حق کے طور پر عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ اگر ہم غور کریں تو یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ آزادی اظہار ہی کا ایک نام جمہوریت ہے جو ہمارے عہد کی پہچان ہے اور آزادی اظہار کا ایک قابلِ فخر کارنامہ عقلی رویّے کا فروغ و ارتقا ہے۔ غرض آزادیِ اظہار اور عہد

جدید ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

صحافت آزادی اظہار کو بروئے کار لانے کا ایک ذریعہ ہے جسے ہم ایک سائنس بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک فن بھی۔ صحافت کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے آگہی ایک سائنس اور اس کی بہ حسن وخوبی پیش کش ایک فن ہے۔ ایک اچھا صحافی سائنس اور فن کو ایک ہی وقت میں بروئے کار لاکر حالات کے تقاضوں، اخلاقی قدروں اور حسن بیان کی نزاکتوں کے امتزاج سے عوامی شعور میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ آزادی کا کوئی تصور بغیر پابندی کے ممکن نہیں۔ آزادی بغیر پابندی انتشار کو جنم دیتی ہے۔ جب کہ حقیقی آزادی معاشرتی سکون و یک جہتی پر منتج ہوتی ہے۔ البتہ ہر معاشرے سے ایک ہی جیسی پابندیوں کی توقع کرنا معقولیت سے بعید ہے، کیوں کہ ہر معاشرے کی ساخت، اس کی روایات اور اس کے تصورات اخلاق مختلف ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر معاشرے کے حالات اور تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم پاکستان میں رہ کر یہاں کے حالات سے آنکھیں بند کر کے مغرب کی صحافت کی تقلید شروع کردیں تو یہ عمل ہمارے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کے مترادف ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے صحافی اپنے مقدس پیشے کے اصولوں اور مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے ملکی حالات اور معاشرتی کوائف کے تقاضوں سے بے نیاز کچھ دوسری مصلحتوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ رویہ ہمارے قومی نقصان کا سبب اور اجتماعی انتشار کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارے صحافی بھائیوں میں اس نقصان کا احساس جس قدر جلد بیدار ہوجائے ملک وقوم کے حق میں اتنا ہی مفید ہے۔

کچھ صحافیوں کے رویّے پر اس گفت گو سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اپنی پوری صحافی برادری سے مایوس ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ صحافت کے شعبے میں ہماری ایک مضبوط روایت ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، چراغ حسن حسرت، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر اور حمید نظامی آج بھی صحافت کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے موجودہ صحافیوں میں بہت وقیع و معتبر نام ہیں جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا کچھ مناسب نہیں۔

ہمارے صحافیوں کو اپنا محاسبہ خود کر کے تعمیر پاکستان کے سلسلے میں مثبت راہِ عمل کی نشان دہی کرنی چاہیے تاکہ وہ تعمیر ملت میں اپنی ذمے داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوسکیں۔

صحافتِ امروز

یہ بات اب ایک پامال حقیقت بن چکی ہے کہ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ حالات کی نئی کروٹوں سے جس صورت کی نمود ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ صحافت جدید تہذیب کی جان ہے اور یہ پورے معاشرے کے رگ وپے میں خونِ حیات کی طرح گردش کرتی ہے۔ صحافت کا یہ کردار اس کی جھولی میں دفعتہً اتفاقات کی کسی لہر نے نہیں لا ڈالا بلکہ اس کی ترتیب وتشکیل میں اُن ان گنت عوامل کا ناگزیر دخل ہے جن سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شب وروز اسے سامنا رہتا ہے۔ کونوں میں دبک کر صحافت شاید سسک تو سکتی ہے، لیکن وہ زندگی کی بو قلموں گہما گہمی، سوز وجستجو، امید وبیم، غم و انبساط، شرافت وسرکشی کی بدلتی ہوئی تعبیروں کے ہمہ جہتی مناظر پیش کرنے سے قاصر رہے گی۔

اس صورتِ حال سے صحت وسہولت کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج کے کارپردازانِ صحافت کو اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے لیے شعور وآگہی اور علم ووقار کی کتنی گہرائی اور گیرائی درکار ہے۔ نیز اِس میں عظمت دانش کے ساتھ ساتھ دیانت دل کتنی شدت کے ساتھ ضروری ہے۔ اِن دونوں کی یک جائی اور ہم آہنگی نہ تو ہمیشہ پائی جاتی ہے اور نہ یہ خود بہ خود ایک فطری عمل کے طور پہ بر بروئے کار آتی ہے۔ پھر میں جب "دیانت دل" کہتا ہوں تو اس سے میری مراد محض فنِ صحافت سے ہنرمندانہ وفاداری نہیں ہوتی بلکہ اس کا وہ وسیع تر مطلب بھی ہوتا ہے کہ جو جدید صحافت کی کرداری خاصیت ہے اور جس کی طرف ابھی میں اشارہ کرچکا ہوں۔ صرف اور صرف عظمتِ دانش کے کارنامے نہ تو ممکن الوجود ہیں اور نہ کسی طرح مستحسن۔ اس کا تصور "فن برائے فن" کے اس نظریے کی طرف لے جاتا ہے کہ جس میں سوزِ حیات کبھی بھی نہیں پایا گیا اور جو ایک عرصے سے تصوراتی عجائب گھر کی بے کشش زینت بن چکا ہے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کے جس گوشے میں بھی عقل وخرد صرف اپنے مجرد حصار میں بند رہ کر کوئی کارنامہ انجام دے وہ محیّر العقول تو ہوسکتا ہے، لیکن سرد وبے کیف۔ پس میں جب صحافت میں عظمت دانش کے ساتھ دیانتِ دل کی بات کرتا

ہوں تو اس سے میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ صحافت کی اُس اہم ترین ذمے داری کی نشان دہی کروں۔ جو انسانی معاشرے کی ہیئت ترکیبی، اس کے وجود، اِس کی بقا اور اس کے فروغ کے تقاضوں کے ساتھ وفاداری کا عنوان ہے۔

صحافت کی یہ کرداری خاصیت اس کی فنی ہنرمندی کی عظمتوں سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے فنّی ہنرمندی پوری صحافت کی قدرِ مشترک ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی معاشرے سے ہو۔ اس کی کرداری خاصیت کا ایک اساسی پہلو ایسا ہے جو مختلف معاشروں میں بدل جاتا ہے۔ اس فرق کو فنِ صحافت میں دیانت و خوبی کے ساتھ سمو دینا ہی صحافت کی اس معاشرے کے ساتھ باکمال وفاداری ہے۔ جو صحافت ایسا کرنے سے قاصر ہو وہ یا تو صریحًا بددیانت ہے یا نااہل ہے یا پھر بدقسمتی سے ان دونوں محرومیوں کی حامل ہے۔ آپ یہ تصوّر نہیں کر سکتے کہ کسی بھی اشتراکی معاشرے میں سرمایہ دارانہ اقدارِ حیات سے کھلّم کھلّا تو کیا معنًا بھی نرم و نازک (SUBTLE) اظہار وفاداری بھی کی جاسکتی ہے۔ میں اشتراکی معاشرے کو اس معاملے میں قصوروار نہیں ٹھیراتا۔ نظریاتی معاشرے کی فطری اور اٹل طلب ہی یہ ہے کہ اس میں منقسم وفاداریوں کی گنجائش کو ختم کر دیا جائے۔

بلاشبہ پاکستان بھی ایک نظریاتی معاشرہ ہے اور اس کی اپنی اور جُداگانہ نظریاتی خصوصیات ہیں۔ اِس کے نظریے کے مطابق انسان ایک مطلق العنان ہستی نہیں بلکہ وہ خالقِ کائنات کا نمائندہ ہے۔ اس نظریے میں توحید الٰہی کے تحت وحدتِ آدم اور وحدتِ زندگی کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک مربوط اور ہمہ گیر نظام کے تحت انسان کی حریتِ فکر و عمل اور اس کی تخلیقی قوتوں کی تگ و تاز پر ایک اور صرف ایک پابندی پائی جاتی ہے وہ پابندی یہ کہ قول و فعل کی تمام کاوشوں کی وفاداری ذاتِ باری کے فرمودات اور اس کے آخری رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ وابستہ رہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی مُسلم تاریخ صحافت پر نظر ڈالیے تو صحافت کی فنّی خوبی اور کرداری خاصیت کے بصیرت افروز مناظر سامنے آتے ہیں۔ الہلال، زمیندار، کامریڈ اور ہمدرد ان اوصاف کا مرقع تھے اور آزمائش و ابتلا کی سنگین ترین گھاٹیوں سے گزر کر وہ ان پر پورے اُترے۔

کاروانِ صحافت کے وہ عظیم رہ نما اُٹھ گئے یا تاریخ کے حوادث نے انھیں صحافت کی قافلہ سالاری سے ہٹا دیا۔ پاکستان بنا اور آزادی، نظریاتی آزادی کے نئے تقاضوں کا ہجوم ہوا۔ آپ بتائیں کہ آج کی صحافت ان تقاضوں سے کس بلاغتِ فکر و نظر، کس عظمتِ کردار، کس ثباتِ وفاداری، کس گرمیِ تخلیق، کس سوزِ فروغِ اسلام اور کس جذبۂ ترقی پاکستان کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہی ہے؟ میری تلخ نوائی ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میں پوچھوں کہ وہ کیا تقاضے ہیں جن کے لیے اسکینڈلوں کو اُچھالا جاتا ہے؟

وہ کیا تقاضے ہیں کہ جن کے تحت اخبارات و جرائد سے بالعموم یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ جنس و جرائم کا اشتہار اور سیاسی ہلڑ بازی کی رپورتاژ ہیں؟ بات ایک واقعہ یا چند واقعات کی نہیں۔ "لبرل ازم" کے پردے میں قوم کو جو دھوکا پوری آزادی کے ساتھ دیا جا رہا ہے، وہ کن حدوں کو چھوتا ہے اور اس کی جولان گاہ مخصوص سے کون سی ذہنیت کا چسکا وابستہ ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ چند اصلاحی مستثنیات کے علاوہ کوئی اخبار اور کوئی رسالہ اردو یا انگریزی کا ایسا نہیں جس سے یہ رنگ نہ ٹپکتا ہو۔ حالات سے آنکھیں بند کر کے نعروں کی زبان اختیار کر لینا دانش مندی کا تقاضا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے میں یہ نکتہ پورے اصرار کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ حریتِ فکر و عمل اور آزادی افکار و اظہار کے نام پر اسلام کی نظریاتی نہج اور تہذیبی روایت کو "گھیلانے" کی کوئی کوشش پاکستان میں صحافت کی کرداری خاصیت کے مطابق نہیں ہے۔ یہ نظریاتی وفاداری نہیں ہے، نظریاتی بغاوت ہے۔ آپ چونک گئے، لیکن چونکنے کی وجہ میرے اظہار کی دیانت کے بجائے صحافت کی موجودہ کرداری خاصیت ہونی چاہیے۔ بظاہر میرا بیان کھردرا اور میرے الفاظ سخت ہیں، لیکن اگر انصاف سے کام لیا جائے اور انصاف کا پیمانہ یہ نہ ہو کہ صحافت میں جنس و جرائم اور ہلڑ باز سیاست کی کوریج کل کی نسبت آج قدرے کم ہے، بلکہ انصاف کا پیمانہ یہ ہو کہ کیا کسی اشتراکی نظریاتی ریاست میں اس قسم کے انحراف کی رمق بھی پائی جاتی ہے؟ تو عادلانہ جائزہ اس سے مختلف نہیں ہوگا۔

شاید یہ کہا جائے کہ اشتراکی ریاست میں نظریاتی انحراف کا چوں کہ انفرادی و عمرانی سطح پر کوئی عملی وجود نہیں ہوتا اس لیے وہاں کی صحافت بھی اس کی رپورٹنگ نہیں کرتی جب کہ یہاں کی صحافت کی مشکل یہ ہے کہ انحراف اور منافقتیں چاروں طرف موجود ہیں اور اسے رپورٹنگ کے لیے اس کے سوا کم ہی مواد ملتا ہے۔ یہ عذر ایک حد تک بجا ہے، لیکن اوّل تو ہمارا معاشرہ خیر کے مظاہر سے خالی نہیں، پھر صحافت، خالص نظریاتی صحافت، کا کام یہ تو نہیں کہ خبرِ خیر کو دوسطری کونے میں دبا دیا جائے اور ہلڑ باز سیاست اور جنس و جرائم کے کارناموں کو جلی سرخیوں سے شائع کر کے عوام کی ترغیب پذیر اور نیم پختہ نفسیات کے لیے نوالۂ تر بنایا جائے۔ پھر یہ غیر محتاط اور فحش تحریریں کیا معنی رکھتی ہیں؟ فروغِ لذّت کام و دہن کی یہ تقلیدی فراوانیاں مغرب کی "لبرل ازم" کی وفادار پاسبان تو یقیناً ہیں، لیکن کیا ان کا کوئی سروکار اس تہذیبی روایت سے بھی ہے جو انسان کو اسلام نے فراہم کی ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ اقبال تو ان دونوں کے دانائے راز تھے اور مجھے امید ہے کہ آپ کو اس بات میں ان کی رائے کا علم ہوگا۔ تاہم ذرا سن لیجیے:

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

دورِ زوال کے مشرق کی تقلیدی سرشت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اقبال کو تو یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہاں تو جو راہیں جدت کے نام سے متعین کی جاتی ہیں وہ بھی دراصل تقلیدِ مغرب ہی کی شکلیں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہا :

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ محکومی محض سیاسی غلامی نہیں ہوتی بلکہ اس کی بدترین صورت ذہنی غلامی ہے۔ یہ بات اقبال نے بھی ذہنی غلامی کے بارے میں کہی ہے:

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز!

اسلام کے فکری فریم ورک میں جمود و تقلید کے لیے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی لیکن یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ ایک عرصے سے خود اس کے وابستگان کی کوتاہ بینی جمود و تقلید کی سہل انگاری میں مگن رہی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کبھی جمود و تقلید کا اظہار خالص مذہبی پیرائے میں ہوا ہے اور کبھی اس نے مغربی فکر و تہذیب کی کم ہمت دریوزہ گری کی صورت اختیار کی ہے۔

مجھے پاکستان کی صحافت کے مسائل و موانع کا پورا پورا احساس ہے۔ ان میں سرفہرست پورے معاشرے کے نفاق اور دوغلے پن کا مسئلہ ہے۔ عمرانی طور پر یک رنگی کے فقدان نے ہماری صحافت کو بھی دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی طویل مدت کے لیے صحافت کے لیے یہ بے حد سنگین مرحلہ ہے کہ وہ بہ حیثیت مجموعی عمرانی نفاق سے بالاتر رہ کر نظریاتی یک سوئی کا موقف اختیار کرلے۔ کم از کم اتنا ہی سنگین مسئلہ یہ ہے کہ اب تک پاکستان کی کسی ہیئت حاکمہ نے اس عجیب و غریب روش کو ترک کرنا گوارا نہیں کیا جو اس نے اپنی شوکت اقتدار کی خاطر اختیار کر رکھی ہے یعنی خلاف اسلام تہذیبی اقدار کی ترویج و اشاعت کو فیاضی کے ساتھ کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ان حالات میں صحافت اور اہلِ صحافت دونوں کو اپنا اپنا پیٹ تو بہرحال بھرنا ہے، جس سے نتیجہ اس سے مختلف نہیں نکل سکتا جو سامنے ہے۔

پاکستانی صحافت کی میرے دل میں اس لحاظ سے بے انتہا قدر و منزلت ہے کہ جب کبھی قوم و ملک کو کسی خطرے کا سامنا ہوا ہے اس کے سوادِ اعظم نے قابلِ فخر و ستائش دانش مندی، جرأت، ایثار اور وارفتگی کا ثبوت اور فنی مہارت سے اس نے قوم کی دھڑکنوں کا ساتھ دیا ہے۔ بایں ہمہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں اور ایک خوگر حمد کی نیاز مندی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی صحافت کا مقدر جتنا رفیع و عظیم ہے اُس کی نسبت اِس کا کردار ناتمام ہے۔ اس سے زیادہ اندوہ ناک المیہ یہ ہے کہ اس فرق و فاصلے کے شعور اور اسے ختم کرنے کی تڑپ کے آثار بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

نا امیدی میری سرشت میں داخل نہیں اور میں بدترین حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے موقف پر ثبات و استقلال سے ڈٹ جانے کا عادی ہوں۔ لیکن مجھے یہ پوچھنے تو دیجیے کہ ہم اور ہماری صحافت کہاں کھڑے ہیں؟

یہ بے لاگ جائزہ خود اس امر کا طالب ہے کہ ہم اپنے سامان سفر کو ایک دفعہ پھر سنبھالیں اور منزل کی طرف لگن، اعتماد، تدبر، وقار، یک سوئی اور تعاون و شرافت کے ساتھ تیزی سے گام زن ہو جائیں۔ اس سے تائید و نصرت الٰہی کی برکتیں حاصل ہوں گی۔ ادب و صحافت میں پرورش لوح و قلم کا یہی انداز فروغ آدمیت کا ضامن ہے۔

پاکستانی صحافت

یوں تو قرآن حکیم از اول تا آخر معجزانہ قصائص اور حکیمانہ نصائح کا ایک ایسا لازوال مرقع ہے کہ جس کا احاطہ انسان کے لیے ناممکن ہے۔ تاہم اس کی ابتدا ایسی حیرت انگیز ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کی صداقت نمایاں ہو کر سامنے آتی جاتی ہے۔ قرآن نے پہلی وحی میں علم و قلم کی اہمیت پر زور دیا۔ اس میں گویا یہ نکتہ بھی پوشیدہ تھا کہ انسانی ترقی قلم ہی کی مرہون منت ہوگی۔ علم و فن کے بغیر ترقی کے مراحل طے نہیں ہو سکیں گے اور جب تعلیم عام ہو جائے گی اس وقت بھی قلم ہی کی حکمرانی رہے گی۔ چناں چہ اس دور میں جتنے بھی ذرائع ابلاغ ہیں وہ سب قلم ہی کے سہارے قائم ہیں۔ ان میں ریڈیو اور ٹیلے وژن کے علاوہ وہ بے شمار کتابیں ہیں جو انسانی اذہان کو متاثر کرتی ہیں۔ تقابلی جائزہ لیا جائے تو شاید یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہو کہ صحافت ان میں سرفہرست ہے۔ آج ساری دنیا کے عوام میں بیداری پیدا ہو چکی ہے اور وہ اپنے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور دوسرے تمام مسائل میں دل چسپی لینے لگے ہیں۔ صحافت ان کے انداز فکر و عمل پر اثر انداز ہونے والا اہم ترین ذریعۂ ابلاغ ہے۔ اس زمانے میں کوئی حکومت عوام کی مرضی کے خلاف بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے اب حکومتیں رائے عامہ کا احترام کرتی ہیں اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتیں جو عوام کے جذبات کے خلاف ہو۔ یہ رائے عامہ بڑی حد تک صحافت ہی کے ذریعے سے پروان چڑھتی ہے۔ چناں چہ آزادی سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کو طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کا حال معلوم ہوا تو ان میں اسلامی جوش از سر نو پیدا ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کو روزنامہ کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے ہمدرد نکالا۔ مولانا وحید الدین سلیم نے لکھنو سے مسلم گزٹ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال شائع کیا۔ ان اخباروں نے مل کر مسلمانوں میں ایسا جوش و خروش پیدا کیا کہ وہ "نظریۂ حیات" کے لیے تن من دھن کی قربانیاں دینے کو تیار ہو گئے۔ اسی طرح جب ملک میں سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں تو مسلمانوں کے اخباروں نے

آزادی وطن اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صحافیوں نے بے شمار قربانیاں پیش کیں۔ اکثر نے لمبی لمبی قیدیں کاٹیں اور کثیر مالی نقصانات برداشت کیے، لیکن منزل کی لگن ان تکلیفوں پر غالب رہی اور وہ صراط مستقیم پر قائم رہے۔

غرض صحافت ایک ایسا ذریعۂ ابلاغ ہے جس سے قوموں کے اذہان کو بدلا جاسکتا ہے، ایک انداز فکر پیدا کیا جاسکتا ہے اور "رائے عامہ" کو متاثر اور متحرک کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح تلوار ایک عادل اور انصاف پسند شخص کے ہاتھ میں مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اور ظالم شخص کے ہاتھ میں عوام پر ظلم و ستم کا ذریعہ بنتی ہے اسی طرح صحافت بھی ہے۔ اس کے ذریعے سے عوام کے دلوں میں قومی نظریے سے والہانہ محبت پیدا کی جاسکتی ہے۔ ملک اور قوم میں اتحاد و یک جہتی کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے کر ان میں ایک ساتھ زندہ رہنے اور ایک ساتھ مرنے کی لگن پیدا کی جاسکتی ہے اور اگر تخریب پر آمادہ ہو تو اینٹ سے اینٹ بھی بجائی جاسکتی ہے۔

صحافی قوم کی قسمت کو جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں قوم کا معمار، جمہوریت کا پاسبان، اور آزادی اظہار رائے کا علم بردار ہوتا ہے۔ وہ شر کی طاقتوں سے لڑ کر خیر کا بول بالا کر سکتا ہے۔ وہ اسلام دشمن عناصر کا کام یابی کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کا استحصال کر سکتا ہے۔ وہ ان عاقبت نااندیش سیاسی طالع آزماؤں کے تخریبی عزائم کا پول کھول کر انھیں بے اثر بنا سکتا ہے جو "علاقائیت" کے نام پر ملک کی "وحدت" کو نقصان پہنچاتے اور اس کی سالمیت کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ وہ رائے عامہ کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہے۔ صحافت طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے اور صحافی اسے جس طرح چاہے کام میں لاسکتا ہے۔

اکثر صحافی "آزادی صحافت" کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں۔ بے شک کام یاب صحافت کے لیے آزادی ناگزیر ہے، لیکن دنیا میں کسی ایسی آزادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو۔ صحافی نہایت ذمے دار بھی ہوسکتا ہے اور غیر ذمے دار بھی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو نوجوان ترکوں کا انقلاب کام یاب ہوا اور صحافت راتوں رات آزاد ہوگئی۔ لیکن بعض صحافیوں نے اس آزادی کا ایسا غلط مطلب لیا کہ پابندیاں دوبارہ عائد کرنی پڑیں۔ دوسرا دل چسپ تجربہ ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان کے بعد ہوا۔ اخباروں کو لامحدود آزادی مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بے چینی اور مشرقی ترکیہ میں بغاوت شروع ہوگئی۔ آخر آزادی کو پابندیوں میں مقید کرنا پڑا۔

پاکستانی صحافت کو بھی ان تجربات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اور یہاں کے تمام مسلمان اس معنی میں ایک قوم ہیں کہ وہ پاکستان کو متحد رکھ کر ایک

مضبوط اور خوش حال ملک بنائیں اور اسلامی احکام کو حرزِ جان بنائیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہمارے صحافیوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ " اسلام ہمارا دین، پاکستان ہمارا ملک " کے اصول کو سامنے رکھ کر اپنی ذمے داریاں پوری کریں۔ وہ نہایت آزادی کے ساتھ جمہوریت کی حمایت کریں۔ ملک کے ہر طبقے اور ہر علاقے کے باشندوں کے ساتھ عدل و انصاف پر حکومت کو متوجہ کریں اور ایسا اسلامی معاشرہ تعمیر کیے جانے کی طرف رہ نمائی کریں جس میں ہر شخص کی بنیادی ضرورتوں کی کفالت حکومت کی ذمّے داری ہو، لیکن اس طرح کہ ملک کی سالمیت میں شگاف نہ پڑے اور نظریۂ پاکستان کو نقصان نہ پہنچے۔

صحافت کے ذیل میں جن مسلّمات کی بابت میں نے یہ چند اشارات رقم کیے ہیں ان کے بارے میں جب میں پاکستان کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے زیادہ اطمینان نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جس سے دل و دماغ میں ایک انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے محسوسات یہ ہیں کہ پاکستان میں صحافت نظریۂ حیاتِ ملّی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس پر طاغوتی غلبے کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ پاکستان میں واضح طور پر اور بدیہی طور پر نظریۂ حیاتِ ملّی اسلام ہے اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریۂ فکر و حیات نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ اگر آزادیِ صحافت کا مفہوم اور معنی یہ ہیں کہ صحافت کو نظریۂ حیاتِ ملّی سے متصادم کر دیا جائے اور اس تصادم کے لیے راہوں کو ہموار اور وسیع بھی کر دیا جائے تو پاکستان کے نقطۂ نظر سے آزادی کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ پاکستان میں صحافت کو اس حد تک آزادی دی گئی ہے کہ صحافیوں کا ایک طبقہ نظریۂ حیاتِ ملّی سے بغاوت پر آمادہ و مستعد رہا ہے۔ میری رائے میں پاکستان میں آزادیِ صحافت کا مفہوم و معنی صرف اور صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ صحافی کا قلم حدودِ اسلامی میں رہ کر خدمت اور قومی و ملّی مسئلے پر بے لاگ تنقید کرے اور ایک مسلم نقاد کا کردار اور ایک باشرع ناقد کا فرض ادا کرے۔

پاکستان میں ایسا نہیں ہوا اور یقیناً نہیں ہوا۔ یہاں نظریۂ اسلامی سے متصادم اور متضاد ادب و صحافت کو پوری آزادی ملی جس نے نہ صرف غیر اسلامی نظریات کی تبلیغ کی بلکہ افرادِ ملت میں فکری انتشار اور ذہنی خلفشار بھی پیدا کیا۔ حتیٰ کہ ایسے جرائد و رسائل بھی پوری آزادی کے ساتھ شائع ہوتے اور ہو رہے ہیں جو پاکستان کے افراد میں شہوانیت و حیوانیت پیدا کر رہے ہیں اور ان میں جنگلی انسان کی خصوصیات پیدا کر رہے ہیں۔ اگر ایسی صحافت کو ڈھیل دی جاتی ہے اور اسے مفہوم آزادیِ صحافت سمجھا جاتا ہے تو میری رائے میں یہ دیانت داری نہیں ہے اور جو صحافی اس میدان میں کارگزار ہے وہ نہ صرف یہ کہ نظریۂ پاکستان کا وفادار نہیں، بلکہ وہ اللہ کا باغی بھی ہے۔

اس مملکت خداداد پاکستان میں ایسے صحافی بھی ہیں کہ جن کا قلم متوازن ہے، جن کے ذہن عدل وانصاف کی عظمت کو قبول کرتے ہیں اور جن کے دل نظریۂ اسلامی سے ہم آہنگ ہیں۔ افکار و حوادث کو وہ اس کے صحیح پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ وہ پاکستانی اذہان میں کوئی انتشار پیدا نہیں کرتے اور احتیاط کے ساتھ اصلاح حال پر ان کو تیار کرتے ہیں۔ یہی صحافی پاکستانی صحافت کے آئینہ دار کہلانے کے مستحق ہیں۔

کتاب اور کتاب خانے

کتاب ماضی، حال اور مستقبل کے علوم و افکار کا خزانہ ہے۔ کتاب کا مطالعہ مہذب افراد اور قوموں کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے۔ کتاب خانے تاریخ اور ثقافت کا انمول خزانہ ہیں۔ ان کا قیام، حفاظت اور ترقی ہر باشعور قوم کا اوّلین فرض ہے۔

کتاب کی اہمیت وافادیت

مسلمانوں کی علمی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہر مقام پر یہ حقیقت واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ اہل اسلام کا جہاں اور جب تک کتاب اللہ سے گہرا تعلق رہا جملہ علوم وفنون کی ایجاد وترقی ان کے نامۂ اعمال کا حصہ رہی۔ اللہ کی اس کتاب نے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ایسی شمع دی جس سے انھوں نے مشرق ومغرب کے جہل کی تاریکیوں کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔ ان تاریخی حقائق سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آج کا دور علم کا دور ہے۔ اس دور میں حقائق کی پردہ پوشی ممکن نہیں رہی۔ علم انتہائی سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اور اس کی رفتار مستقبل کی طرف تیز ہورہی ہے اور پیچھے ماضی میں بھی جاری ہے۔ آج کا انتہائی ترقی پسند انسان نہ صرف علمی جستجو کے شوق میں بلکہ مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے بھی ماضی اور حال کے رشتوں کو مربوط کررہا ہے۔ یہ خصوصیت مسلمانوں کی تھی کہ وہ اپنے حال کو ماضی سے منقطع نہیں ہونے دیتے تھے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کو اب یہ تخصیص حاصل نہیں رہی۔ اس لیے تمام عالم اسلام ایک ایسی ذہنی مغلوبیت کا شکار ہے کہ اس کو مغرب کی شاگردی اچھی معلوم ہونے لگی ہے۔ ادھر مغرب کا حال یہ ہے کہ وہ اس سارے سرمایۂ علم وعمل کا امین ہے جو کبھی مسلمانوں کا تھا۔ اس نے آج کے تمام رشتوں کو انتہائے ماضی سے جوڑ دیا ہے اور اس مستحکم بنیاد پر اس نے تسخیر ماہ تاب کا عظیم ورفیع کارنامہ انجام دے دیا۔ روس نے جب پہلی بار "اسپوٹنک" فضائے آسمانی میں بھیجا تو اپنے اس کارنامے میں عربوں کی کاوش سے استفادے کا دبے لفظوں میں اعتراف کیا۔

اسلام بنیادی طور پر علم وعمل کا دین ہے۔ اس کی تمام تعلیمات علم وعمل پر زور دیتی ہیں قرآن میں عمل کا پیغام موجود ہے:

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض (الجاثیۃ: ۱۳)

(اور اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کردیا)

اس آیت میں عمل کا حکم ہے اور اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں اگر مسلمان اپنے ماضی کو اپنے حال سے منقطع نہ کرتے تو تسخیر ماہ تاب ان ہی کا کارنامہ ہوتا۔

حکیم ابوالمقنع اپنا مصنوعی چاند فضا میں بلند کر کے چودہ میل کو روشن کر سکتا تھا اور جب چاہتا مصنوعی چاند کو واپس لا کر کنویں میں بند کر دیتا تھا۔ اسے سائنس کا ایک بڑا کارنامہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ سٹیلائٹ کو فضا میں معلق رکھنے اور چاند پر جانے اور واپس آنے کا تعلق حکیم ابوالمقنع کی ایجاد و دریافت سے کیوں نہیں جوڑا جاتا؟

میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں، مگر کتاب اللہ کے ذیل میں یہ باتیں کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ بات کتاب سے شروع کی تھی۔ کتاب کے بارے میں میرا اندازِ فکر یہ ہے کہ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ گھر ایک ایسے جسم کے مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔ جس درس گاہ میں کتابیں نہ ہوں وہ درس گاہ اس درس گاہ کی طرح ہے جس میں طلبہ نہ ہوں۔ جس شہر میں کتب خانے نہ ہوں وہ شہر ویران ہے۔ جس جگہ کتب خانہ ہو، لیکن لوگوں کو کتابوں سے عشق و محبت نہ ہو وہاں وہ کتب خانہ علم کی بس ایک نمائش گاہ ہے۔ یہ نمائش جاری بھی رہ سکتی ہے اور زمانے کے دست برد کی نذر بھی ہو سکتی ہے۔

انسانی تہذیب کے ہر دور میں کتاب کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیبِ انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں ہو سکتا جو کتاب سے تہی دامن ہو جائے اور فکر کتاب سے آزاد ہو جائے۔ دراصل کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ کتابیں بحرِ حیات کی سیپیاں ہیں جن میں پُراسرار موتی بند ہیں۔ اگر ہم ان کی تعریف میں ادبی اور شعری اندازِ بیان اختیار کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ کتابیں معلومات کے ثمردار درختوں کے باغ ہیں، گزرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل ہیں، حسن و جمال کے آئینے ہیں اور وقت کی گزری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں لافانی بلبلیں ہیں جو زندگی کے پھولوں پر سرمدی نغمے گاتی ہیں۔ محی الدین بن عربی کے الفاظ میں "کتاب پھلوں کا ایک ایسا باغ ہے کہ اسے ساتھ لیے پھرو اور جہاں چاہو اس سے خوشہ چینی کر لو۔"

نامور عرب شاعر المتنبی کہتا ہے، "دنیا بھر میں کتاب سے اچھا کوئی رفیق کسی کو میسر نہیں آ سکتا۔" کتاب بہترین رفیق ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایک طبیب کی حیثیت سے میرے خیال میں کتاب ایک ایسا ادبی نسخہ ہے جس سے وہ لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں جنھیں اس کی ضرورت ہے۔ یہ نسخہ مرکب بھی ہو سکتا ہے اور غیر مرکب بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی بہت سے

ہوں۔ خیالات بالکل کیمیائی طریقے پر متحد بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تحلیل نہ ہوں اور اس شیرے کی شکل اختیار کرلیں جو روغنی اجزا کو پانی میں گھول کر بنایا گیا ہو۔

چوں کہ کتاب ایک ادبی نسخہ ہوتی ہے اس لیے اس کو بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ میں نے دوران مطالعہ اس موضوع کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ ایک صحیح نسخے میں چار چیزیں شامل ہوتی ہیں :

۱۔ اساسی عنصر یا خصوصی جزو ترکیبی جس کے ذریعے سے علاج کرنا مقصود ہے۔
۲۔ ایک معاون دوا جس کے ذریعے سے اصل دوا کا اثر تیز ہو جائے۔
۳۔ ایک مصلح دوا جس کے ذریعے سے ناپسندیدہ اثرات کا تدارک ہو سکے۔
۴۔ ایک ایسی شے جس کے ذریعے سے دوا کے استعمال میں آسانی ہو اور مریض کو دوا ناخوش گوار معلوم نہ ہو۔

مشہور ادیب جاحظ کتاب کے بارے میں کہتا ہے :

"کتاب کا حصول اس قدر آسان ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ ہمیں عجائبات کی سیر کراتی ہے۔ اس کے ذریعے سے ہمیں سلجھے ہوئے ذہن کے مصنفین کے خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ کتاب ہمیں اسلاف اور ان لوگوں کے حالات بڑی آسانی سے مہیا کر دیتی ہے جن تک ہم پہنچ نہیں سکتے۔

کتاب جیسا ساتھی کس کو مل سکتا ہے کہ جب آپ چاہیں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جائے اور جب آپ پسند کریں تو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے، بلکہ آپ کی خواہش ہو تو آپ کے جسم و جان کا جزو بن جائے۔ جب تک آپ چاہیں خاموش رہے اور جب آپ کا جی اس سے بولنے کو چاہے تو چہکنے لگے۔ آپ کسی کام میں مصروف ہوں تو وہ خلل انداز نہیں ہوتی اور آپ تنہائی محسوس کریں تو آپ اسے ایک شفیق ساتھی محسوس کریں۔ کتاب ایک ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا اور نہ کبھی آپ کا ساتھ دینے سے جی چراتا ہے۔"

جاحظ جس کا یہ قول میں نے دہرایا ایک دن مطالعے میں غرق تھا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر اور ایک تودہ اس پر گرا، وہ جاں بحق ہو گیا اور کتابوں ہی کے درمیان وہ ابدی نیند سو گیا۔

ادبی دواسازی کے بارے میں بس اتنا میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ جس چیز کو ادبی رنگ کہا جاتا

ہے اس کے پرکھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کتاب کے سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا اس میں کوئی اساسی عنصر موجود ہے یا نہیں؟ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا مصنف نے اپنی تعلی کی اصلاح کے لیے کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ اور سب سے زیادہ اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو دوا پیش کی گئی ہے وہ اس قدر خوش گوار ہے کہ حلق سے نیچے اُتر جائے۔ پھر اس پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ یہ نسخہ ایسے عناصر سے مرکب تو نہیں ہے۔ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں اور فساد کا سبب بن جائیں۔

ہم کسی بھی حیثیت سے غور کریں، کتاب کا مقام بہ ہر اعتبار بہت بلند ہے۔ کتاب ہماری تہذیب کا جزو ہے اور ہمارے اسلاف کی کتاب دوستی دنیا کی علمی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ مسلمانوں کو کتابوں اور کتب خانوں سے ہمیشہ لگاؤ رہا اور یہ لگاؤ ان کی علمی ترقی اور تہذیبی بلندی کا ذریعہ رہا۔ مسلمانوں نے علم حاصل کرنے کے لیے اور علم کو روبہ عمل لانے کے لیے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں۔ کتابیں حاصل کرنے کے لیے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ پہلے کے دور میں جو صاحب ثروت تھے انھوں نے کتاب کے مقابلے میں دولت کو ہیچ سمجھا اور جو تنگ دست تھے انھوں نے ضخیم کتابیں اپنے ہاتھوں سے نقل کر کے اپنی علمی تشنگی دور کی۔ ایک ایک کتاب حاصل کرنے کے لیے مہینوں تگ و دو کی۔ اگر میں یہ کہوں تو ہرگز غلط نہ ہوگا کہ یہ کتاب دوستی ہی تھی کہ جس نے مسلمانوں کو نہ صرف علمی میدان میں آگے بڑھایا بلکہ عملاً دنیا کا رہ نما بنایا۔

لیکن افسوس ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اب ہمیں کتاب سے محبت نہیں رہی۔ ہمارے ہاں ایسے دولت مند گھرانوں کی کوئی کمی نہیں جہاں آپ کو ایک کتاب بھی نہیں ملے گی اور جو کتاب کا مطلب حساب کے رجسٹر یا بہی کھاتوں کے علاوہ نہیں جانتے۔ حال آں کہ ہمارا ہی ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ کسی مسلمان کا گھر اس وقت تک تعمیر ہی نہیں ہوتا تھا جب تک اس کے نقشے میں کتب خانے کا اہتمام نہ ہو۔ کسی حویلی کی بنیاد ہی نہیں رکھی جاتی تھی جب تک اس کے نقشے میں کتب خانے کو مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو۔ اگر آپ اندلس کی تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیں گے تو بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔ مسلمانوں کا یہ وہ دور تھا کہ جب جنگی قیدیوں کے تبادلے میں جنگی قیدی نہیں کتابیں لی جاتی تھیں اور جنگی قیدیوں کا تبادلہ ایک عالم سے کیا جاتا تھا۔

کتاب دوستی اور علم دوستی کی اس طرح کی مثالیں آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی پیش نہیں کی جاسکتیں۔ ہمیں اس پر بڑی احتیاط کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اس صورت حال کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ہم غریب ہیں اور ہم کتابیں مہیا نہیں کر سکتے اور نہ کتب خانے قائم کر سکتے ہیں۔ مگر میری رائے میں صورت حال یہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں علم و کتاب سے تعلق اور محبت

نہیں رہی۔ ہم معاشی اور معاشرتی حیوان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں اور کتاب کا مطلب کتاب حساب سے آگے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہے، اور بہ ظاہر یہی صورت حال نظر آتی ہے، تو ہمیں بنیادی سبب پر غور کرنا ہوگا۔

کیا ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی ایسی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے علم کی وقعت اور کتاب کی اہمیت و حیثیت کے ادراک صحیح سے ہماری نسلیں محروم ہو رہی ہیں ؟

اہلِ فکر و نظر اس موضوع پر گزشتہ کئی سالوں سے غور و فکر میں مصروف ہیں۔ میں جہاں تک ان کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرسکا ہوں اور جہاں تک خود میرے تاثرات اور محسوسات کا تعلق ہے، میری رائے یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں بنیادی خرابیاں موجود ہیں۔ ان خرابیوں کی اساس یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے ہنوز ہم نے اپنے وجود کے مقصد کو نہیں سمجھا اور نہ ہی ہم یہ فیصلہ کرسکے کہ پاکستان کو ہم کیا اور کیسا بنانا چاہتے ہیں؟ ایک راہ مستقیم سے صرف نظر کرکے اور ایک متعین راستے سے ہٹ کر ہم اپنے درد کی دوا جہاں تلاش کرتے رہے وہاں ہمارے اسلامی وجود کی نفی کی سعی و کاوش کے سوا اور کچھ موجود نہیں۔ ہم نے اپنے حقیقی ملی تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے مغرب سے خوشہ چینی میں عمر کے پینتالیس سال اور اپنی پوری تین نسلوں کی عمریں صرف کردیں اور اس کے ماحصل کے طور پر ہمیں ذہنی انتشار، ملی نفاق اور ظاہری طمطراق کے سوا کچھ نہیں ملا۔

آپ ضرور غور فرما سکتے ہیں کہ ان اجزائے ترکیبی سے وہ نسخۂ شفا ہرگز تیار نہیں ہوسکتا جو ہمارے مرض کا مداوا کرسکے اور ہمارے درد کی دوا بن سکے۔

اگر ہم پوری دیانت سے کام لیتے تو آزادی کے دوسرے ہی دن ہمیں ایسا نصاب تعلیم وضع کرلینا چاہیے تھا جو ہمارے ان ملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جن کے لیے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ لیکن حکومتی انتشارات، صاحبان اقتدار میں مبلغ علم کے فقدان اور معتمدین تعلیم کی اسلامی اور ملی بے حسی کی وجہ سے ابھی تک کوئی ایک پاکستانی نصاب تعلیم نہیں بن سکا۔ اس کا یہی نتیجہ ہوسکتا تھا کہ ہم علم اور کتاب کی محبت سے محروم ہوجائیں اور آج ہم ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ اب وقت دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے اور کتابوں سے ہماری پہلے جیسی محبت اور شغف عود کر آئے۔

لائبریری کی ضرورت

اشاعت علم اور وسعت معلومات میں کلب اور جامعات کے ساتھ ساتھ کتب خانے جو اہم کردار ادا کرتے ہیں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ لائبریری سائنس کی مقبولیت اپنی جگہ اس کی دلیل ہے کہ اب کتب خانوں کی اہمیت کو واضح طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے ملک میں کتب خانوں کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے اور اسی اعتبار سے کتب خانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تاہم اس رفتار ترقی پر مطمئن نہیں ہوا جاسکتا۔ ابھی کتب خانوں کو معاشرے میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو ہمارے اسلاف ان کو دیتے تھے۔ موجودہ سائنسی اور فنی ترقی کے دور میں دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلنا ضروری ہے۔ لائبریری کی اہمیت کو اجاگر کرنا ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کا فرض ہے۔ کتب خانوں کی صحیح تنظیم اور اشاعت علم میں تعاون کے ذریعے سے کتب خانوں کے کردار کو عوام اور حکومت پر عملاً واضح کیا جاسکتا ہے۔

لائبریری کی حیثیت ایک امین ہی کی نہیں ایک معلم کی بھی ہے۔ کتابیں حصول علم کا سہل ترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ طباعت و اشاعت کی ترقی اور رسل و رسائل کی وسعت نے کتابوں کی اشاعت اور رسد کو سہل اور سستا بنا دیا ہے۔ اس سہولت سے بھی اگر آدمی فائدہ نہ اٹھائے اور مطالعے کی عادت نہ ڈالے تو اس کو المیہ ہی کہنا چاہیے۔ پچھلے زمانوں میں کتاب کا حصول نہایت مشکل تھا۔ طباعت کی آسانیاں نہ تھیں۔ آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، لیکن اس کے باوجود لوگ کتابوں کے دیوانے تھے۔ ایک ایک کتاب کو حاصل کرنے کے لیے میلوں پیدل سفر کرتے تھے۔ ضخیم ضخیم کتابیں اپنے ہاتھوں سے نقل کرتے تھے اور اس کو مصیبت کے بجائے راحت خیال کرتے تھے۔ آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ہر قسم کی کتاب ہر وقت مل سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم سب سے کم وقت اور سب سے کم دولت جس چیز پر خرچ کرتے ہیں وہ کتاب ہے۔ جب حالات یہ ہوں تو ہمارے دماغوں کو روشنی اور ہماری روح کو بالیدگی کہاں سے اور کیسے میسر آئے؟ علمی ترقی کے بغیر مادی ترقی ممکن نہیں۔ سائنس کے بغیر

صنعت کا فروغ محال ہے۔

جب تک ہماری قوم ان واضح حقائق کو نہ سمجھے گی کتب خانوں کی ترقی کی رفتار سست رہے گی اور اس راہ میں مشکلات حائل رہیں گی۔ اگر ہمیں لائبریریوں سے سچی دل چسپی اور دلی لگاؤ ہے تو مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے اور استقلال کے ساتھ لائبریریوں کے قیام کی تحریک کو فروغ اور کتابوں اور کتب خانوں کے قیام کے لیے کوششوں میں مصروف رہنا چاہیے۔ اسی طرح ہم اپنے علمی، ادبی اور مذہبی سرمائے کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کر سکیں گے اور اپنی آئندہ نسلوں کو اپنا علمی ورثہ پہنچا سکیں گے۔

لائبریری کا ارتقا

اس دنیا کا بلکہ ستاروں سے بھی آگے پھیلے ہوئے تمام جہانوں کا سب سے پہلا لائبریرین میرے خیال میں اس ذات باری کو کہا جاسکتا ہے جو خالق ارض وسما، ہم سب کا پالن ہار اور معبود حقیقی ہے۔ اس نے اپنی سب سے پہلی لائبریری کو وقت اور مقام کی قیود سے آزاد رکھ کر قائم کیا تھا۔ توریت، زبور، انجیل، قرآن پاک اور نہ جانے اس کی کتنی مقدس دستاویزات ہیں جن کو وہ یکے بعد دیگرے حسب ضرورت اپنے پیغمبروں پر نازل کرتا رہا ہے۔ انھی الہامی کتب اور دستاویزات کی روشنی میں ہم نے مختلف علوم وفنون کو رواج دیا۔ ان علوم وفنون کے ذخیروں سے ہم نے اپنی لائبریریاں آباد کیں اور ان لائبریریوں میں جمع ہونے والے نوادر سے اپنی ذہنی کاوشوں اور دماغی صلاحیتوں کو ترقی دی۔ چوں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اس لیے لائبریریوں کے قیام کا سلسلہ بھی روز اول سے شروع ہوا اور ابد تک جاری رہے گا۔

انسان اور حیوان میں جو فرق بتایا جاتا ہے وہ تہذیب وتمدن سے عبارت ہے۔ کوئی قوم مہذب اور متمدن نہ ہو تو نوع انسانی اسے کوئی درجۂ قبولیت نہیں دیتی۔ کسی قوم کی تہذیبی اور تمدنی حیثیت کو جانچنے کے لیے اس کے علوم وفنون کے ذخیروں اور ثقافتی ورثوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ یہ ذخیرے آثار قدیمہ یا کتب خانوں کی صورت میں جمع ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس زمانے میں بھی جب کہ انسان نے اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کی صورت میں لکھنا نہیں سیکھا تھا اس نے اپنے خیالات کو تصاویر کے ذریعے سے مٹی کی تختیوں اور چٹانوں پر منتقل کیا۔ وہی تصاویر دنیا بھر کی زبانوں کی بنیاد بنیں اور ان زبانوں میں لکھی ہوئی تحریروں نے کتابوں کی صورت اختیار کی۔ جب ان کتابوں کو جمع کرکے ایک ساتھ اور ایک جگہ رکھا گیا تو اس جگہ کو کتب خانہ یا لائبریری کہا جانے لگا۔

کتاب کے اوراق کے لیے اس زمانے میں کاغذ ضروری ہے، لیکن کاغذ کی ایجاد سے قبل مٹی کی اینٹوں، پتھر کی سلوں، لکڑی کے تختوں، کھال کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور اس کی

چھال وغیرہ کو تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ چناں چہ یہ حقیقت قابل غور ہے کہ کتاب کے لیے یونانی زبان کا لفظ "ببلوس" یا لاطینی زبان کا لفظ "لبر" جس مادے سے مشتق ہے اصطلاحی اعتبار سے اس کے معنی ہی درخت کی چھال ہیں۔ یونان اور روم کے زمانۂ عروج کی جو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں وہ درختوں کی چھال کو کوٹ پیس کر بنائے ہوئے اوراق ہی کی شکل میں ہیں۔ بابل و نینوا اور مصر کے قدیم ترین علما اپنے الفاظ کو مٹی کی تختیوں پر نقش کرتے تھے۔ اس اشکالی تحریر کو مختلف ادوار میں خط میخی اور خط ہیروغلیفی کہا جاتا تھا۔

نینوا کی سنہ ۱۸۵۰ میں کھدائی ہوئی تو ایک انچ مربع سے بارہ انچ مربع تک کی مٹی کی ایسی تختیاں برآمد ہوئیں جن پر خط میخی میں عبارات لکھی ہوئی تھیں۔ مورخین کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر تختی ایک کتاب کا ورق ہے اور ان کو ترتیب سے ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ الگ الگ ایک ہزار کے قریب دستاویزات تھیں اور جس وسیع ہال سے ان کو برآمد کیا گیا تھا وہ شاہی دستاویز خانہ تھا۔

مصر کے ایک علاقے ہیلیوپولس میں کھدائی ہوئی تو بابل کی تہذیب و ثقافت سے ملتے جلتے نقوش برآمد ہوئے اور معلوم ہوا کہ ہر عبادت گاہ سے ملے ہوئے دالانوں میں ایسے پیشہ ور کاتب رہتے تھے جن کا کام مٹی کی تختیوں پر عبارات لکھنا تھا۔ چناں چہ ایک ایسا ضخیم رکارڈ برآمد ہوا جسے شاہ خوفو کا کتب خانہ تسلیم کیا گیا۔ یہ بادشاہ فراعنہ کے چوتھے خاندان کا ایک رکن تھا۔ اسی طرح شاہ خافری کے عہد کا ایک کتب خانہ برآمد ہوا۔ اس فرماں روا نے مصر کا دوسرا بڑا ہرم تعمیر کرایا تھا۔

شاہ آخن آتن کا دستاویز خانہ بھی برآمد ہوا۔ لیکن مصر کے قدیم ترین عہد کا سب سے مشہور کتب خانہ وہ ہے جو مغربی ثیبہ میں رعمسیس دوم نے قائم کیا تھا۔ اس کا عہد حکومت ۱۳۰۰ سے ۱۲۳۶ قبل مسیح ہے۔ مشہور مورخ یوستھاسیس کا کہنا ہے کہ ممفس کے مقام پر ایک ضخیم ذخیرۂ کتب تھا جو ایرانی حملہ آوروں نے مسمار و تباہ کر دیا تھا۔

یونان کے مشہور کتب خانے وہ تھے جو پِسِس ترانس، بقراط، اقلیدس، نکوقراطس، یوریپیڈیز اور ارسطو کی ذاتی ملکیت تھے۔ طب کے موضوع پر ایک خاص ذخیرۂ دستاویزات جزیرۂ نیدوس سے برآمد ہوا۔ ارسطو نے اپنا کتب خانہ اپنی زندگی ہی میں اپنے شاگردوں کے نام وقف کر دیا تھا۔

اسکندریہ میں کتابیں مرتب کرانے اور جمع کرنے کا شوق تو بہت پرانا تھا لیکن بطلیموس کے

عہد میں جو ذخیرۂ کتب جمع ہوا وہ قابل ذکر کہا جاسکتا ہے۔ وہاں دو کتب خانے تھے۔ ایک بڑا برشیم کے علاقے میں تھا اور دوسرا چھوٹا سیراپیم میں تھا۔ صحیح رائے قائم کرنا تو مشکل ہے، لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ اول الذکر میں چار لاکھ نوے ہزار اور آخر الذکر میں بیالیس ہزار آٹھ سو کتابیں تھیں۔ یہ سب نرسل کے بنے ہوئے ان کاغذ نما ٹکڑوں پر تھیں جنھیں "پے پائی رس" کہا جاتا ہے اور جنھیں اہل عرب قافیر کہتے تھے اس عہد کے ایک مشہور لائبریرین کالی ماخس نے دنیا کی پہلی فہرست کتب تیار کی تھی جو اس لائبریری سے متعلق تھی۔ اس فہرست میں موضوعات کے اعتبار سے ایک سو بیس عنوانات کے تحت کتابوں کے نام درج کیے گئے تھے۔ گویا اس زمانے میں کتابوں کو ترتیب دینے کا نظام اعشاری نظام سے ملتا جلتا تھا۔ شاید اتنا تنوع موجودہ زمانے کے کتب خانوں کی فہرستوں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اسکندریہ کا بڑا کتب خانہ ۶۴۰ تک قائم رہا۔ سوئی داس مورخ کا خیال ہے کہ انطاخیس اعظم نے اپنے کتب خانے کا مہتمم شہر کالیس کے ایک شاعر یوفورین کو مقرر کیا تھا۔

روم کے کتب خانے بھی کچھ کم مشہور نہیں تھے۔ تاہم سیسرو اور ایٹی کس کے ذخیرے سب سے زیادہ قابل ذکر تھے۔

ذاتی ملکیت سے ہٹ کر سب سے پہلا عوامی کتب خانہ پلائنی اور ادود نے قائم کیا تھا جب نیرو کے عہد میں سارا روم جل کر تباہ ہوگیا اور اسے نئے سرے سے دوبارہ آباد کیا گیا تو ویسپا ین نے امن کا مندر تعمیر ہو جانے کے بعد ایک کتب خانہ بھی اس میں قائم کیا جو عوام کے لیے تھا۔

ولادت مسیح سے بہت عرصے پہلے بابل ونینوا اور مصر کی تہذیبیں امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکی تھیں اور یونان وروم کی تہذیبوں نے سسکنا شروع کر دیا تھا۔ جب نصرانیت سے مقابلہ شروع ہوا تو اس کش مکش میں مدھم پڑ جانے والے نقوش بالکل ہی مٹ گئے اور پھر ایک زمانے تک دوبارہ نہ پنپ سکے۔ حتیٰ کہ اسلامی دور نے تاریکی کو روشنی میں بدلنا شروع کیا۔

اولین کتب خانے کے ازلی مہتمم رب العزت نے اپنی لائبریری کی آخری کتاب اپنے آخری رسول ﷺ کو سپرد کر کے اس کی حفاظت اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی اور اس طرح یہ رہ نمائی کی کہ اس سے استفادہ کر کے ہزاروں لاکھوں کتابیں مرتب کی جائیں اور دنیا میں مثالی لائبریریاں قائم کی جائیں۔ یہ کام جتنا اہم تھا اتنا ہی دشوار بھی تھا اور وقت چاہتا تھا۔ چناں چہ عہد قدیم کے دوسرے ممالک کی طرح دنیائے اسلام میں حکم رانوں سے پہلے افراد کو اس ضرورت کا احساس ہوا۔ انھوں نے اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے اور ان کے رکھ رکھاؤ میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ ہر ممکن طریقے سے

کتابیں جمع کیں اور ان کو حاصل کرنے میں بے دریغ دولت خرچ کی۔
تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے مسلمانوں نے کتابوں کی جتنی قدر و منزلت کی وہ ان سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔ ان کے نزدیک دولت روپے پیسے کا نہیں صرف علم اور کتابوں کا نام تھا۔ یہی ان کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اسی لیے وہ کتب خانے کو خزینۃ الحکمت اور اس کے مہتمم کو خازن کہتے تھے۔ ان کے نزدیک کتابوں کی جو قدر و قیمت تھی اس کا اندازہ مشہور مورخ ابن مسکویہ کے ایک بیان سے ہوتا ہے۔ یہ مورخ خلافت عباسیہ کے ایک وزیر ابن العمید کے کتب خانے کا مہتمم تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ایک بار ڈاکوؤں کی جماعت نے ابن العمید کے مکان پر زبردست ڈاکہ ڈالا۔ انھوں نے تمام گھرانے کو رسیوں سے باندھ دیا اور سارا سامان لاد کر لے گئے یہاں تک کہ پانی پینے کا کٹورا تک نہ چھوڑا۔ جب ابن العمید کو قید و بند سے رہائی ملی تو اس نے رو کر پوچھا " اور میری کتابیں کیا ہوئیں؟" ملازمین نے بتایا کہ کتابوں کو الٹ پلٹ کیے جانے کی وجہ سے ان میں سے بعض کی جلدیں ٹوٹ گئی ہیں اور اوراق پھٹ گئے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سب کی سب موجود ہیں۔ یہ سن کر ابن العمید نے سجدۂ شکر ادا کیا اور اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ تمام ضروریات کی چیزیں تو دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن نادر کتابیں ناپید ہو جائیں تو ان کا نعم البدل ممکن نہیں۔
اسی زمانے کے ایک اور عالم صاحب ابن عباد نے سامانی خاندان کے ایک فرماں روا کی طرف سے پیش کردہ منصب وزارت کو قبول کرنے سے محض اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کے لیے اپنے کافی بڑے کتب خانے کو اپنے ساتھ منتقل کرنا دشوار تھا اور اس سے جدائی بھی ناممکن تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کتب خانے میں صرف دینیات کی کتابیں اتنی تعداد میں تھیں کہ انھیں چار سو اونٹوں پر لادا جا سکتا تھا۔
انفرادی کتب خانوں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے سب سے پہلا اسلامی کتب خانہ بیت الحکمت کے نام سے ہارون الرشید نے بغداد میں قائم کیا تھا جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فخر اس کے بیٹے مامون الرشید کو حاصل ہوا۔
بیت الحکمت کا ایک بڑا حصہ دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے طور پر بھی تھا جہاں مختلف زبانوں کے بہت سے عالم مہینے کے تیسوں دن اور سال کے بارہ مہینے سر جھکائے کتابوں کے تراجم و تالیف کا کام کرتے رہتے تھے۔ ایک شعبے میں جو دارالکتابت کہلاتا تھا، ہر ترجمے یا تصنیف کی کئی کئی نقلیں ساتھ ساتھ تیار ہوتی رہتی تھیں۔ تکمیل کے بعد وہ کتب خانے میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ نقلوں کی تعداد ہر کتاب کی افادیت کو مدنظر رکھ کر متعین کی جاتی تھی۔ چناں چہ قرآن شریف کی بعض تفسیروں کی تعداد کئی کئی ہزار تک

تھی ۔ خود قرآن شریف کے تقریباً ڈھائی ہزار نسخے موجود تھے ۔ جملہ کتابوں اور ان کے نسخوں کی مجموعی تعداد ساٹھ لاکھ تھی ۔ زیادہ نقلیں تیار کرانے کا جواز یہ تھا کہ کتب خانہ عوام کے لیے تھا اور بعض اہل علم اپنی جائز ضرورت کے تحت کتابیں لے جاکر واپس نہیں کرتے تھے یا ان کے پاس سے وہ ضائع ہو جاتی تھیں ۔ ایسی صورت میں وہ کتاب کی مقررہ قیمت ادا کرتے تھے اور اس کارروائی کو جائز قرار دیا گیا تھا ۔ اگر نقلیں زیادہ تعداد میں نہ ہوتیں تو بہت سی کتابیں ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتیں ۔ اس عمدہ اہتمام کے باوجود منتظمین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس بے مثل کتب خانے کی یکسر تباہی کا ایک وقت آنے والا ہے ۔ چناں چہ اس روشن تصویر کا تاریک رخ یہ ہے کہ جب ہلاکو نے خلیفہ المعتصم کے عہد میں بغداد پر حملہ کیا اور قتل و غارت گری برپا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیا تو یہ نادر کتب خانہ بھی ظالموں کی تباہ کاریوں سے نہ بچ سکا ۔ ان نسخوں کے سوا جو بعض لوگوں نے مستعار لے کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیے تھے کوئی کتاب یا نقل باقی نہ بچ سکی ۔ اس وقت تک اگرچہ عرب کے مسلمانوں نے لڑائی میں قید ہو جانے والے چینیوں سے نباتی کاغذ بنانے کا فن سیکھ لیا تھا اور بغداد میں ایسے کاغذ کا کارخانہ بھی قائم ہو گیا تھا اور بیشتر کتابوں میں اس کاغذ کا استعمال بھی ہوا تھا ، لیکن اس دور سے پہلے کی کتابیں اس وقت کے رواج کے مطابق باریک جھلیوں کے تختوں پر لکھی ہوئی تھیں ۔ ان میں تیزی سے جل جانے کی صلاحیت تھی ۔ اس لیے آتش زدگی زیادہ ہولناک اور تباہ کن ثابت ہوئی ۔

بغداد کی طرح مسلمانوں نے ہر جگہ عظیم الشان کتب خانے قائم کیے ۔ ان ہی میں سے موصل ، بصرہ ، حلب ، طرابلس ، قاہرہ ، غزنہ ، نیشاپور اور اندلس کے کتب خانے بہ طور خاص قابل ذکر ہیں ، لیکن وہ کسی نہ کسی حادثے سے ضائع ہوتے رہے ۔ اس لیے قدیم عہد کے بہت سے نوشتے آج بالکل ناپید ہیں اور بعض فہرستوں میں ان کا صرف ذکر باقی رہ گیا ۔

کاغذ کی ایجاد کتب خانوں کے فروغ کے لیے ایک نیک فال تھی ۔ طباعت کے فن نے رواج پاکر ترقی کی رفتار کو بے حد تیز کر دیا ۔ اس وقت ترقی یافتہ ملکوں میں کتب خانوں کا جو حال ہے ان کے بارے میں کہنا پڑتا ہے کہ ان میں طلسم ہوش ربا کی کوئی جلد موجود ہو یا نہ ہو ، لیکن کتابوں کی تعداد اور نوعیت کے لحاظ سے وہ خود طلسم ہوش ربا بنے ہوئے ہیں ۔ ان پر تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ان کے برعکس اپنے ملک میں کتب خانوں کی تعداد کا جو حال ہے وہ افسوس ناک ہے اور ہم سب کی توجہ کا محتاج ہے ۔

نظامِ تعلیم اور کتب خانے

کتاب، حفاظت کتاب اور استعمال کتاب کا تعلق بنیادی طور پر اس فکر و نظر اور قلب و ذہن سے ہے جو ایک قوم، ایک ملت اور آزاد مملکت کی ایک ہیئت حاکمہ مجموعی طور پر وطن اور اہل وطن کے لیے رکھتی ہے۔ تاریخ معلوم کا گہرا مطالعہ مختلف ادوار کا مشاہدہ اور تمام تاریخی شہادتیں ہماری رہ نمائی اس طرح کرتی ہیں کہ ہر وہ قوم اور ملت اور ہر وہ سلطنت و مملکت جو اقوام و ملل عالم میں ممتاز اور متشخص ہوئی ہے، اس کی عظمت و رفعت، سربلندی و سرفرازی اور اس کی عزت و شہرت اس بنیاد پر ہوئی ہے کہ اس نے تعلیم کو اولیت کا درجہ دیا، اس کے ہاں تعلیم کو مقام اوّل و اولیٰ حاصل رہا اور علم و عالم کی قدر دانی اور عزت افزائی اس کا منتہا ئے فکر رہا۔

اس کے برعکس، تاریخ شاہد ہے اور تاریخ کا ہر صفحہ گواہ ہے کہ جن اقوام و ملل نے اپنی کجیِ ذہن کی بنا پر، ناسلامتی فکر و نظر کی وجہ سے اور اپنی غفلتوں سے تعلیم کو اہمیت اور اولیت نہیں دی، علم کو نظر انداز کیا اور عالم کی ناقدری کی، اس ناشناسی علم و عالم نے ایسی تمام اقوام کو ہمیشہ قعر و مذلت میں رکھا اور پستیاں ان کا مقدر ہوئیں۔

جو لوگ فطرت کا مشاہدہ کامل کر سکتے ہیں اور وہ لوگ جو فطرت سے متصادم نہیں ہیں وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ تعلیم کے باب میں فطرت کے اس متعین و مقرر اصول میں کبھی اور کسی دور میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

اس روشنی میں آپ ایسی مملکت کے حالات پر غور کریں کہ جو بنام اسلام اور بہ عنوان اسلام عالم وجود میں آئی اور جو قطعی طور پر ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس باب میں منفرد اور یکتا بھی۔ ظاہر ہے کہ میرا روئے سخن میرے اپنے پیارے وطن کی طرف ہے جس کا قیام ایک تاریخ ساز حقیقت ہے۔ جو معرض وجود میں اس طرح آئی کہ بے اندازہ قربانیاں دی گئیں۔ جو منصۂ شہود پر اس لیے جلوہ گر ہوئی کہ ہم اسے مملکت اسلامیہ بنائیں گے اور یہاں ہر فرد اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالے گا کہ جس کا رہ نما قرآن و

اسلام ہے اور جس کی ہدایت ہادی برحقؐ سے ملی ہے۔

میں بہ بانگ دہل اور بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سب سے زیادہ بے توجہی اور غفلت جس موضوع سے ہوئی ہے وہ تعلیم ہی ہے۔ تعلیم سے بدیہی صرف نظر، علم سے عدم محبت اور تضحیک عالم صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ جب ہم اسلام سے روگردانی کرلیں اور اس کے زریں اصولوں کو نظر انداز کر دیں۔

پاکستان میں نظام تعلیم کے تعلق سے میری رائے یہ ہے کہ ہمارے ہاں نظام کتاب رائج رہا ہے۔ بے سروپا کتابیں لکھی جاتی ہیں اور فکر و نظر سے عاری لوگ انھیں پڑھاتے ہیں۔ نہ استاد کچھ سمجھتا ہے اور نہ طالب علم کچھ حاصل کرتا ہے۔ ہمیں حالات کی اس شدت سے جلد سے جلد نکل آنا چاہیے۔ اس میدان میں مخلصانہ اور مشفقانہ پیش رفت صاحبان فکر و نظر اور ماہرین تعلیم کی طرف سے ہونی چاہیے۔

اب کتابوں کی بات ہے تو اس کے بارے میں پہلے ذرا اپنے ماضی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ اس سے اپنے حالات کا موازنہ کرتے اور ان کی نزاکت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مرزا حیرت دہلوی حالات سعدی میں لکھتے ہیں :

> " دارالعلوم نظامیہ پورا ایک شہر تھا۔ لاتعداد کمرے اور ایک وسیع ہال تھا جس میں دس ہزار انسان سما سکتے تھے۔ یہاں قرآن، فقہ، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم کی تدریس کا پورا انتظام تھا۔ ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا تھا جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی پڑھائی جاتی تھیں "

★ خلیفہ عبدالرحمان سوم نے (۹۱۲ تا ۹۶۱) اندلس کے پایۂ تخت قرطبہ میں ایک عظیم الشان یونی ورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس میں صرف اندلس کے طلبا ہی زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یورپ، افریقہ اور ایشیا کے تشنگان علم بھی علم و حکمت کے اس چشمۂ شیریں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس یونی ورسٹی کی لائبریری بڑی وسیع تھی۔ مختلف علوم و فنون پر یہاں چھے لاکھ کتابیں موجود تھیں اور ان کی مکمل فہرست تھی جو چوالیس جلدوں میں مرتب تھی۔

(مقالہ شام ہمدرد حضرت پیر کرم شاہ ازہری)

★ قرطبہ میں اس لائبریری کے علاوہ ستر پبلک لائبریریاں مزید تھیں اور ہر مسجد اور مکتب کے ساتھ ایک لائبریری لازمی جز کی حیثیت رکھتی تھی۔

★ قاہرہ میں خلیفہ عزیز باللہ نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں کتابوں کی تعداد سولہ لاکھ تھی۔

★ نصیر الدین طوسی نے مراغہ میں جو رصدگاہ بنائی تھی اس میں چار لاکھ مخطوطات جمع کیے گئے تھے۔
★ ایک وزیر مہلبی ۹۶۳ء میں فوت ہوا۔ اس کی ذاتی لائبریری میں ایک لاکھ ستر ہزار کتب تھیں۔
★ ایک نوجوان ابنِ عباد جو اسی وزیر کا دوست تھا، اس کے ذاتی کتب خانے میں دو لاکھ چھے ہزار کتابیں تھیں۔

(اس کے برعکس ذرا غور فرمائیے کہ پاکستان کی زندگی میں اب تک کوئی ایک وزیر بھی ایسا آیا ہے جس کا کوئی کتب خانہ ہو اور علم و تعلیم سے اسے کوئی لگاؤ رہا ہو؟)

★ ابن ندیم کی "فہرست" جو دس جلدوں میں ہے کتابوں کی تعداد کی نشان دہی کرتی ہے۔

یہ میں نے چند اشارات کیے ہیں۔ اسلامی دور کے کتب خانوں پر ایک نہایت اہم کتاب الحاج محمد زبیر صاحب استاد لائبریری سائنس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے لکھی ہے جو ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں اسلامی ممالک کے کتب خانے، برصغیر ہند کے کتب خانے، عہد سلاطین دہلی کے کتب خانے، دکنی سلطنتوں کے کتب خانے، ہندستان کے مختلف علاقوں کے کتب خانے، برصغیر پاک و ہند کے کتب خانے، پنجاب کے کتب خانے وغیرہ کی تفصیل ہے۔

میں نے یہ باتیں اس لیے لکھی ہیں کہ ہم اپنے ماضی کو ذرا غور سے دیکھیں۔ یہ وہی اہل اسلام ہیں جن کے وارث ہم ہیں۔ ہم نے کتاب و کاتب کے ساتھ جو معاملہ کر رکھا ہے وہ لائق فکر اور قابل اصلاح ہے۔

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اور اس مرض کے علاج کے لیے اولین نسخۂ شفا ایک ایسے نظام تعلیم کا نفاذ ہے کہ جو ہمارے نظریات ملّی سے ہم آہنگ اور ہماری ملّی امنگوں کا آئینہ دار ہو۔ اس سلسلے میں میری چند گزارشات ہیں :

★ ایک سچا نظام تعلیم ہی کتاب سے محبت اور علم و عالم سے انس والفت کا درس دے سکتا ہے۔
★ ایک صحیح نظام تعلیم کتب اور کتب خانوں کو تعلیم کے لیے اولیت واہمیت کا درجہ دیتا ہے۔
★ نظام تعلیم کو بیوروکریسی کے ظالم ہاتھوں سے نکال کر کلیتہً اہل علم اور ماہرین تعلیم کے ہاتھوں میں دینا چاہیے۔
★ یہ انتہائی ضروری ہے کہ لائبریری کے قیام کے لیے نجی سطح پر جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کی ہمت افزائی کی جائے اور موجودہ ہمت شکنی سے گریز کیا جائے جو بیوروکریسی کے مزاج کی آئینہ دار

ہے۔

★ پاکستان میں ذاتی کتب خانوں کی دیکھ بھال کا انتظام فوراً ہونا چاہیے اور جو قیمتی کتب اور نوادر ضائع ہو رہے ہیں ان کے تحفظ کا انتظام بلا تاخیر کیا جائے۔ اس وقت جو صورت حال ہے وہ بڑی تشویش ناک ہے۔ خود کراچی شہر کے نیشنل میوزیم میں ۱۰۔ ۱۱ ہزار انتہائی قیمتی مخطوطات درحقیقت ضائع ہو رہے ہیں اور ان کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہے۔

★ پاکستان میں جتنے کتب خانے ہیں، ذاتی یا غیر ذاتی، ان میں موجود مخطوطات کو مائکروفلم کر کے ان کو نہ صرف محفوظ کیا جائے بلکہ ان سے دنیا بھر کے نوادر کے تبادلے کا انتظام کیا جائے۔

پاکستان میں کتب خانوں کا نظام

اگر امعان نظر سے دیکھا جائے تو انسان کی موجودہ علمی، ثقافتی، سائنسی، تحقیقی اور خلائی ترقی کی اساس وہ علوم و فنون اور تجربات ہیں جو ہمارے اسلاف کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ یہ تجربات اور علوم جن ذرائع سے ہم تک پہنچے ان میں سے سب سے بڑا ذریعہ کتاب اور سب سے بڑا وسیلہ کتب خانے ہیں جنھیں ہم بجا طور پر ماضی کے عظیم انسانوں کا دماغ اور مستقبل کی نسل کے لیے مشعل راہ قرار دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کتابیں اگر علم و عقل کا سمندر ہیں تو کتب خانے حکمت و دانش کا بے بہا خزانہ۔ کتب خانوں سے انسان کو علم کی وسعت و گہرائی اور اہمیت و افادیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہ قول بیکن کتب خانوں سے انسان اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے، ذہن کو نشو و نما اور روح کو تازگی بخشتا ہے اور نت نئی معلومات سے مالامال اور مختلف مکاتیب فکر کے فکری اور علمی سرمائے سے روشناس ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے فکر و ادراک کو جلا بخشتا ہے اور اپنے علم و جستجو میں اضافہ کرتا ہے۔

جہاں تک کتب خانوں کی تاریخ کا تعلق ہے یہ اتنی ہی قدیم ہے جتنی تہذیب انسانی۔ ہر دور میں کتب خانے کسی نہ کسی صورت میں علمی اور ثقافتی ورثے کے امین و ضامن رہے ہیں۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ابتدائی زمانے کے کتب خانے اور آج کے کتب خانوں میں کافی اور واضح فرق ہے۔ صرف کتابوں کی تعداد ہی میں نہیں بلکہ مقاصد میں بھی فرق ہے۔ اُس وقت کتب خانے کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے تھے جب کہ آج جمہوریت کے فروغ کے ساتھ کتب خانوں تک رسائی ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ بلاشبہ آج کے دور کو عوامی کتب خانوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ کتب خانوں کے قیام اور علم کے فروغ کے سلسلے میں مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اسلام نے علم کے حصول کو مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ علم کسی کی دولت یا حکمت کسی کی میراث نہیں، بلکہ یہ سب کا بنیادی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے کتب خانوں کے قیام میں بہت دل چسپی

لی۔ چناں چہ ای، ایچ، اسکاٹ کے مطابق اسلامی ممالک میں کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جہاں تشنگان علوم کی پیاس بجھانے کے لیے کم از کم ایک کتب خانہ نہ ہو۔ اسی طرح جوزف میکاب کی تحریر کے مطابق تمام اسلامی ممالک میں مطالعے کے لیے سینکڑوں کتب خانے موجود تھے جن میں لاکھوں کتابیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کتب خانوں میں نہ صرف یہ کہ مطالعے کی تمام آسانیاں ہر ایک کو حاصل تھیں بلکہ لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ تک فراہم کیے جاتے تھے۔ دوسرے معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عوامی کتب خانوں کا رواج اور ارتقا مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔

آج کے جدید دور میں عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق حکومتوں کی جہاں اور ذمے داریاں ہیں وہاں اس کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ملک میں جہالت کے خلاف جہاد کرنے کے لیے درس گاہوں اور جامعات کے قیام کے ساتھ ساتھ عوامی کتب خانوں کا جال بچھائے تاکہ امیر و غریب، چھوٹے بڑے سب ہی علوم و فنون کے قدیم و جدید سرمائے سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنے علم و آگہی میں اضافہ کر کے ملک کے باوقار اور کارآمد شہری بن سکیں۔ جدید علوم و فنون کے رموز سے آگاہی کے بعد اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتب خانوں کے قیام و فروغ میں آج کے ترقی یافتہ ممالک خطیر رقم صرف کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ قومیں زمین ہو یا آسمان، سمندر ہو یا جنگل کا میدان، ہر جگہ ہمہ وقت محیر العقول کارنامے سرانجام دے رہی ہیں۔ کبھی وہ ستاروں پر کمند ڈالتی ہیں کبھی وہ زہرہ و مریخ کو فتح کرنے میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔ غرض سائنس کے میدان میں ایجادات و اختراعات اور تحقیق و جستجو کے ذریعے سے انسانی ضروریات کی بھرپور تکمیل کر رہی ہیں۔

آج کے سائنسی خلائی دور میں کتب خانوں کی اس اہمیت و افادیت کے باوجود ترقی پذیر ممالک میں ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ خود ہمارا ملک بھی اس سلسلے میں بہت پیچھے ہے۔ پاکستان کو قائم ہوئے ۵۴ سال ہو چکے ہیں، مگر کتب خانوں کے فروغ میں یہاں وہ مستعدی نظر نہیں آتی جس کی ایک اسلامی مملکت اور ایک نئی قوم کو ضرورت ہے۔ کتب خانوں کے فروغ کے سلسلے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر جو بے اعتنائی اور غفلت برتی گئی اس کی وجوہات مختلف نوعیت کی ہیں:

★ پاکستان کے قیام کے وقت ملک میں قابل ذکر کتب خانے موجود نہ تھے جن کو سامنے رکھ کر اسی نہج پر دوسرے کتب خانوں کو فروغ دیا جاتا۔ جو اچھے کتب خانے ورثے میں ملے وہ بھی بے توجہی کا شکار ہو گئے۔

★ بہتر اور عمدہ کتب خانوں کی ترتیب و تزئین کے لیے اعلا تربیت یافتہ فنی عملے کی کمی تھی۔

★ گنتی کے چند افراد جو اعلا تربیت یافتہ تھے انھیں کتب خانوں میں ان کی اہلیت کے مطابق

مناسب جگہ نہیں دی گئی لہٰذا وہ متعلقہ حکام کو اس اہم مسئلے پر زیادہ توجہ دلانے میں کام یاب نہ ہو سکے۔

★ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی مسائل کی بھرمار شروع ہوگئی۔ وسائل کی کمی، مہاجرین کی آبادکاری، ملکی دفاع اور انتظامی امور نے حکومت کو ابتدائی چند سال اس اہم مسئلے کی جانب توجہ نہ دینے دی۔

★ ملک میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا بندوبست نہ تھا جب کہ بہتر کتب خانوں کے قیام، بہتر انتظام اور بہتر خدمات فراہم کرنے کے لیے اس قسم کی تعلیم و تربیت ضروری تھی۔

یہ تو تھیں پاکستان کے ابتدائی دور کی باتیں جنھیں نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ مگر بعد میں حکومت نے تعلیم کو عام کرنے پر توجہ کرنی شروع کی اور ملک میں نئی جامعات، کالج اور مدارس قائم کیے جہاں اس وقت لاکھوں طلبہ و طالبات زیورِ علم سے خود کو آراستہ کر رہے ہیں، لیکن ان تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کے قیام، ان کا معیار بلند کرنے اور بہتر خدمات کی فراہمی کے سلسلے میں قطعاً کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ بالخصوص اسکول تو اب بھی کتب خانوں سے محروم ہیں اور اگر ان میں کتب خانے ہیں بھی تو وہ تربیت یافتہ لائبریرین کے وجود سے محروم ہیں۔ جن اسکولوں میں کتب خانے ہیں وہ بھی کلرکوں کے مرہونِ منت ہیں جنھیں فن لائبریری سائنس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ کتب خانے اپنے فرائض کی بجاآوری تسلی بخش طریقے پر کرنے سے قاصر ہیں۔ حصولِ علم میں یہ رکاوٹ طالب علموں کے ذہنوں اور صلاحیتوں کو متاثر کرتی ہے۔ حال آں کہ یہ ذہن اور صلاحیتیں ہی ملک و قوم کا سرمایہ ہیں۔ ملک و قوم کے اس نایاب سرمائے کی بے قدری یقیناً ناقابلِ معافی ہے۔ اسی طرح عوامی کتب خانے جنھیں عوامی علمی خزانے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے پاکستان میں اب تک محدود ہیں۔ عوام کی اتنی بڑی علمی ضرورت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ انسان صرف اسکولوں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھنے کے دوران ہی نہیں بلکہ ساری عمر طالب علم رہتا ہے۔

ایک طرف باضابطہ تعلیم کے لیے باقاعدہ انتظام ہے۔ ڈائریکٹریٹ، ڈپارٹمنٹ، کالج اور یونی ورسٹی کھولنے کا بہتر سے بہتر منصوبہ بنایا جارہا ہے اور اس پر باقاعدہ اور مسلسل عمل درآمد ہو رہا ہے، لیکن دوسری طرف انسان کی علمی جستجو اور تشنگی کو دور کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ شماریات کے ذریعے سے اگر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ملک میں باضابطہ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ طالبانِ علم جواب تک ان اداروں سے فارغ ہو کر باہر آچکے ہیں، ان کی تعلیم کو جاری رکھنے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ یہ کام صرف عوامی کتب خانوں کے ذریعے ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا

جاسکتا تھا۔ اس کوتاہی کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم سبب کتب خانوں سے متعلق پالیسی تشکیل دینے اور اس کو عملی جامہ پہنانے والے کسی بااختیار، ذمّے دار سرکاری ادارے کی عدم موجودگی ہے۔ اس سے نچلی سطح پر کچھ ادارے قائم بھی کیے گئے تو وہاں بھی تربیت یافتہ عملے کی عدم موجودگی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنی۔

کسی بھی کام یا مقصد کے حصول کے لیے منظّم اداروں کا قیام اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے چند امور ضروری ہوتے ہیں۔ ان میں مرکزی حیثیت پالیسی کی تشکیل اور منصوبہ بندی کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس منصوبے کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے ایسی افرادی قوّت کی ضرورت ہوتی ہے جو مسئلے کی نوعیت سے کماحقہ واقف ہو۔ چناں چہ کتب خانوں کی ترقی کے سلسلے میں بھی مندرجہ ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

★ کتب خانوں کی اہمّیت سے کماحقہ واقفیت کے ساتھ جامع پالیسی کی تشکیل۔
★ مقصد کے حصول کے لیے صحیح اور بہتر منصوبہ بندی۔
★ ایسے افراد کا فراہم کرنا جو منصوبہ بندی کے فن سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کے بھی ماہر ہوں اور اس کی افادیت پر بھی یقین رکھتے ہوں۔
★ منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب ادارے۔
★ ادارے میں کام کرنے والے افراد فنّی تربیت یافتہ ہوں اور منصوبے کو صحیح طریقے سے عملی جامہ پہنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔
★ منصوبے کو رُوبہ عمل لانے کے لیے وسائل کی فراہمی۔
★ وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش تاکہ کم سے کم وقت اور محدود وسائل سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔

ان نکات کی روشنی میں اگر ہم تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ابھی تک پالیسی کی تشکیل اور منصوبہ بندی سے لے کر اسے عملی جامہ پہنانے تک کسی بھی مرحلے پر کتب خانوں کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے تربیت یافتہ لوگوں سے مشورے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

منصوبہ بندی کمیشن میں مختلف شعبوں کی منصوبہ بندی کے لیے ان سے متعلقہ ماہرین کی موجودگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کمیشن میں تربیت یافتہ لائبریرین کا نہ تو باضابطہ تقرر کیا گیا نہ ایسی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی جن میں ملک کے لائق اور تجربے کار لائبریرین حضرات کو دعوتِ عمل دی جاتی۔ اسی طرح وزارتِ تعلیم اور محکمۂ تعلیم میں مختلف مضامین میں مشیروں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے

ماہرینِ مضامین کو مقرر کیا جاتا ہے اور وقتاً فوقتاً ملک میں موجود دیگر ماہرین سے بھی مشورہ طلب کیا جاتا ہے، لیکن کتب خانوں کی تشکیل و تنظیم کے سلسلے میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ مرکزی حکومت میں ڈائریکٹریٹ اوف لائبریریز کو وزارت تعلیم کے ایک ذیلی ادارے کی حیثیت سے آرکائیوز کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور کچھ عرصے قبل تک اس کا ڈائریکٹر ایسے آدمی کو مقرر کیا جاتا رہا جو لائبریری سائنس سے بالکل واقف نہ ہوتا تھا۔ بات صرف یہیں نہیں ختم ہوتی بلکہ اس سے نچلی سطح پر محکمۂ تعلیم میں ہر ضروری مضمون سے متعلق ڈائریکٹریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا جو تمام مدارس میں متعلقہ مضامین کے معیار کو پرکھنے اور برقرار رکھنے کا ذمے دار تھا، لیکن ان تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کے معائنے اور ان کے معیار و ترقی کے سلسلے میں کوئی ذمّے دار افسر کبھی مقرر نہ ہوسکا۔ اسی طرح یونی ورسٹی میں کالجوں کی انسپکشن کمیٹی کالجوں کے معیار دیکھنے کے لیے مختلف مضامین کے ماہرین کو نمائندگی دیتی رہی، لیکن کتب خانوں کے معیار کو جانچنے کے لیے یونی ورسٹی لائبریرین کو شاذونادر ہی ایسی کمیٹی میں رکھا گیا تاکہ وہ مختلف کالجوں کے کتب خانوں سے متعلق کم زوریوں کی نشان دہی کرنا اور انھیں معیار پر لانے کی سفارشات مرتب کرتا۔

میونسپل کارپوریشن میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ یہاں ان کتب خانوں کا انتظام انفارمیشن آفیسر کے تحت رکھا گیا ہے جن کی توجہ کتب خانوں کو صرف اطلاعاتی شعبے کے طور پر استعمال کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ چند پارکوں میں ریڈنگ روم کھول کر کتب خانوں کا نام دے دیا جاتا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کتب خانوں کی عوامی ضرورت کو پورا کر دیا گیا۔

مختلف حکومتوں کے دور میں جب کبھی ایجوکیشن کمیشن کی تشکیل ہوئی اور تعلیم کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی اس وقت یہ امید ہوتی کہ اس بار کتب خانوں سے متعلق معقول سفارشات مرتب ہوں گی، لیکن ہر بار مایوسی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

آج کے علمی، تحقیقی اور خلائی دور میں کتب خانوں کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کتب خانوں سے صحیح معنوں میں اسی وقت استفادہ کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل و منظم ہوں اور ان کا انتظام تربیت یافتہ لائبریرین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس سلسلے میں ان باتوں کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ ہر درجے پر موزوں ماہرین کا تقرر ہو اور مشورے کے لیے بورڈ یا کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مختلف مراحل پر کتب خانوں کے قیام کے سلسلے میں ان تجاویز کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

پالیسی کی تشکیل

پالیسی کی تشکیل کے سلسلے میں مرکز اور صوبوں میں وزارت تعلیم کے تحت لائبریری کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے جن کے سربراہ وزرائے تعلیم ہوں۔

مرکز اور صوبوں میں ایک ایک سیکرٹریٹ کتب خانوں کے لیے قائم کیا جائے اور ان کے سربراہ لائبریری سائنس کے ماہرین میں سے مقرر کیے جائیں۔

منصوبہ بندی

منصوبہ بندی کمیشن میں لائبریری کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ یا پھر ایجوکیشن سکشن میں لائبریری کے سلسلے میں لائبریری سائنس کے ماہرین کو مقرر کیا جائے۔

عوامی کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کے کتب خانوں کے لیے بااختیار اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

عوامی کتب خانے

عوامی کتب خانوں کے سلسلے میں انتظامی درجے قائم کیے جائیں۔ مثلاً ضلع، تعلقہ اور تحصیل کے لیے الگ الگ بورڈ ہوں۔ اسی طرح بڑے شہروں میں ہر بلدیہ کا الگ بورڈ قائم ہو۔

تعلیمی اداروں کے کتب خانے

اسکول اور کالج کے کتب خانوں کی دیکھ بھال اور ترقی کے سلسلے میں ہر نظامت تعلیم میں ایک ایک ڈپٹی ڈائریکٹر اور ایک ایک انسپکٹر مقرر کیا جائے۔ یہ عہدے دار لائبریری سائنس کے تجربے کار ماہرین ہوں۔ اسی طرح جامعات میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن میں اساتذہ کے ساتھ لائبریرین کو بھی نمائندگی دی جائے۔ جامعات سے ملحقہ کالجوں کی معائنہ کمیٹی میں جامعہ کے لائبریرین یا اس کے نمائندے کو شامل کیا جائے۔

دانائے سبل

سیرت نبوی کے چند بصیرت افروز پہلو

حکیم محمد سعید

آج سارا عالم اسلام کرب و پریشانی میں مبتلا ہے۔ ایک طرف تو ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں دوسری طرف اسلام دشمن طاقتیں اپنی تمام قوتوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہی ایک ایسا روشن راستہ ہے جو ان حالات میں ہمیں منزل سے ہم کنار کرسکتا ہے۔

جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب وقت کے تقاضوں کو محسوس کرکے ریڈیو سے اور سیرت کے اجتماعات میں ختم رسل، دانائے سبل، رحمتہ للعلمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو پورے خلوص، محنت اور لگن سے پیش کرتے رہے ہیں۔ ان ۴۸ مضامین کو کتابی صورت میں "دانائے سبل" کے نام سے پیش کردیا گیا ہے۔ ان سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ ہادی برحقؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرکے فرد اور معاشرہ دونوں دین و دنیا میں کام یابی اور کام رانی حاصل کرسکتے ہیں۔

یہ مجلد کتاب نہایت خوب صورتی سے چھاپی گئی ہے۔

صفحات : ۱۹۲ قیمت : ستر رپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی پوسٹ کوڈ ۷۴۶۰۰



ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان

ناظم آباد، کراچی